MAULANA ZAFAR ALI KHAN :
HAYAT VA KARNAME

Thesis submitted for the Degree of

Doctor of Philosophy

IN

URDU

BY

RIASAT ALI KHAN

Under the supervision of

Prof. NOORUL HASAN NAQVI

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

1993

مولانا ظفر علی خان حیات و کارنامے

مقالہ برائے پی ایچ - ڈی

نگراں

پروفیسر نور الحسن نقوی

پیش کردہ

ریاست علی خان

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سنہ ۱۹۹۳ء

T4581

M.A. LIBRARY

3 - AUG 1994

T4581

CHECKED-2002

Phone—Office : 336 (Internal)
DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH—202 002

Dated 27-12-93

This is to certify that the thesis entitled "Maulana Zafar Ali Khan Hayat wa karname" which is being submitted for the award of Ph.D. degree by Mr. Riasat Ali Khan is an original research work done under my supervision.

(Prof. Noorul Hasan Naqvi)
Supervisor

Counter-Signed

(Prof. Naeem Ahmed)
Chairman

Chairman,
Department of Urdu
A.M.U., Aligarh

فہرست مضامین

پیش لفظ ---------- 1

پسِ منظر ---------- 5

زندگی کے نشیب و فراز ---------- 25

صحافتی زندگی ---------- 48

بحیثیت سیاسی رہنما ---------- 128

بحیثیت شاعر ---------- 168

بحیثیت ادیب ---------- 218

کتابیات ---------- 228

اخبار و رسائل ---------- 236

پیش لفظ

مولانا ظفر علی خاں کا شمار ہندوستان کے ان مایۂ ناز فرزندوں میں ہوتا ہے - جنہوں نے اپنے زمانے میں بےحد مقبولیت حاصل کی اور تاریخ کے صفحات پر اَن مِٹ نقوش چھوڑے - مولانا ظفر علی خاں انیسویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوئے اور بیسویں صدی کے وسط تک زندہ رہے - اس درمیان انھوں نے صحافت، سیاست، شاعری اور ادب کے میدان میں قابل ذکر خدمات انجام دیں - ان کی خدمات کے پیش نظر ان کی حیات و کارناموں پر تحقیقی نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس کی گئی اور شعبہ اردو علی گڈھ مسلم یونی ورسٹی نے میری تحقیق کا موضوع " مولانا ظفر علی خاں حیات و کارنامے " طے کیا - اس موضوع پر میں نے ان کی حیات اور خدمات کے جملہ پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے - چنانچہ یہ کام کئی ابواب میں مکمل ہوا -

پہلے باب میں پس منظر 1857ع کے بعد کی سیاسی و سماجی صورت حال - سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کی اصلاحی کوششوں کے ذکر کے بعد خود مولانا ظفر علی خاں کے خاندانی پس منظر، آباو اجداد وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے -

دوسرے باب میں ظفر علی خاں کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں. ان کا بچپن کس طرح گزرا، جوانی کے حالات نے ان کی زندگی پر کیا اثر کیا. اور کس طرح وہ صحافت، سیاست اور شعرو ادب کی جانب مائل ہوئے -

تیسرا باب مولانا ظفر علی خاں کی صحافت پر مبنی ہے - اس باب میں ان کی صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے - دکن ریو یو، افسانہ، زمیندار

اور ستارہ صبح کے اداریوں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے - اور ان کی روشنی میں بحیثیت صحافی مولانا کے مقام و مرتبے کا تعین کیا گیا ہے -

مولانا ظفر علی خاں سیاست کے میدان میں مدتوں رہے - اس میدان میں انھیں لانے والوں میں خود ان کے والد مولوی سراج الدین احمد بھی تھے جو خود بھی ایک صحافی تھے اور سیاست میں دلچسپی رکھتے تھے - مولانا ظفر علی خاں شروع میں کانگریس سے وابستہ ہوئے پھر مسلم لیگ کے رکن ہوگئے - انھوں نے ہمیشہ اپنے نظریات کا کھل کر اظہار کیا اور بے باکی سے مسلمانوں کی حمایت کی - وہ آزادی کے متوالے اور اسلام کے شیدائی تھے - ان کی سیاسی زندگی کا بھرپور جائزہ چوتھے باب میں لیا گیا ہے اور سیاست کے میدان میں ان کی مشکلات و مصائب کا بھی ذکر کیا گیا ہے -

مولانا ظفر علی خاں کی سیاسی شاعری بھی قابل توجہ ہے - یہ ایک خاص انداز کی شاعری ہے - جس میں طنز کے ساتھ ساتھ مولانا کا مخصوص تیور بھی ہے - ان کی شاعری پر پانچویں باب میں روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی نعتیہ شاعری کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے - جو سرور کائنات سے ان کی والہانہ محبت کا ثبوت ہے -

چھٹے باب میں مولانا ظفر علی خاں کو بحیثیت ادیب پیش کیا گیا ہے اور ان کی ادبی اہمیت پر بحث کی گئی ہے - اس میں ان کے مضامین، اداریوں اور تراجم کی روشنی میں ان کی نثر کا جائزہ لیا گیا ہے -

آخر میں کتابیات اور اخبار و رسائل کی فہرست درج کی گئی ہے - اس فہرست میں صرف وہ کتابیں اور اخبار و رسائل ہیں جن سے میں نے براہ راست استفادہ کیا ہے -

اس تحقیقی کام میں میرے نگراں پروفیسر نورالحسن نقوی صاحب نے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی اس کے لئے میں ان کا انتہائی ممنون ہوں -

استاذی پروفیسر محمد انصاراللہ صاحب نے پاکستان سے کتابوں کی فراہمی میں میری بڑی مدد کی اور مفید مشورے بھی دیے - اس کے لئے میں ان کا بےحد شکر گزار ہوں -

صدر شعبہ اردو پروفیسر نعیم احمد صاحب نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور ہر طرح سے مدد کی - اس کے لئے میں ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں -

ڈاکٹر صغیر افراہیم اور ڈاکٹر قمرالہدی فریدی نے موضوع پر کام کے دوران مفید مشورے دیے - دیگر اساتذہ شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی -

میں نے اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں پاکستان کا سفر بھی کیا - وہاں کے احباب اور بزرگوں نے بھی میری بڑی مدد کی - جن میں ڈاکٹر وزیرآغا، ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، عنایت اللہ نسیم سوہدروی، پنجاب پبلک لائبریری کے محمد حنیف شاہد اور محترمہ خالدہ صاحبہ نے مولانا ظفر علی خاں کے خاندانی حالات بتاکر میری معلومات میں اضافہ کیا - ان سب لوگوں کا میں شکر گزار ہوں- پاکستان میں جن لائبریریوں سے استفادہ کیا ان میں پنجاب پبلک لائبریری ریسرچ سوسائٹی پنجاب لاہور کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو اورعجائب گھر لاہور کی لائبریری قابل ذکر ہیں -

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بھی میں نے

استفادہ کیا اور ڈاکٹر ضیاالدین انصاری نے میری بڑی مدد کی - رضا لائبریری رام پور، خدابخش اورنٹل پبلک لائبریری پٹنہ اور حیدرآباد کی لائبریری سے بھی میں نے فائدہ اٹھایا - ان سب کا شکر گزار ہوں -

آخر میں ان سب لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی شکل میں اس تحقیقی کام میں میری مدد کی -

ریاست علی خاں

(ریاست علی خاں)
ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

پس منظر

غدر 1857ء کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کا باقاعدہ اقتدار ہو چکا تھا۔ اس لئے باعزت زندگی گذارنے کے لئے مسلمانوں کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ اُن سے دوستی کی جائے۔ کیونکہ اس پُر آشوب انقلاب کے بعد مسلمانوں کی تباہی و بربادی بہت ہو چکی تھی۔ اس بربادی کو دیکھ کر مسلمانوں میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ سب سے پہلے اس جذبہ کو سمجھنے والے خان عبداللطیف خاں، جسٹس امیر علی، سر سید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار تھے۔ سب سے پہلے بنگال میں انگریزوں نے بربادی کی۔ لیکن یہاں کے لوگوں نے برداشت کیا۔ جب انگریزوں نے زیادہ پریشان کیا تو ان کے خلاف آواز بلند کی۔ خان عبداللطیف خاں نے مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے عملی قدم اٹھایا۔ انھوں نے شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے بیان کے مطابق۔

"1853ء میں محمڈن سوسائٹی یا انجمن اسلامی قائم کی۔ اس کے جلسوں میں مسلمان جمع ہو کر مذہبی اور سیاسی مباحثے کیا کرتے تھے"[1]

خان بہادر اپنی زیادہ تر تنخواہ سوسائٹی کے کاموں پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔

1۔ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد۔ مقالات، جلد اوّل ص 113 طبع مجلس ترقی ادب 1966ء لاہور۔

لیکن وہ تحریک جہاد کے خلاف تھے۔ چنانچہ سوسائٹی کے پلیٹ فارم سے اس تحریک کے خلاف تقریریں ہوتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ اس سوسائٹی نے سرکاری حکام میں ایک بلند درجہ حاصل کر لیا تھا۔

1877ء میں ایک ایسوسی ایشن "نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن" کے نام سے جسٹس امیر علی نے قائم کی۔ اس کا مقصد تبلیغی ادارے کھولنا اور سرکاری ملازمتوں میں لوگوں کو حصّہ دلانا تھا۔ 1882ء کے بعد سے اس نے مسلمانوں کے عام مفاد کے لئے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اس تنظیم کو مسلمانوں کے لئے اس لئے مخصوص کیا گیا تھا کہ وہ جدید تعلیم سے بالکل دور تھے۔ انگریزوں نے ان پر قدیم تعلیم کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ اس ایسوسی ایشن کی شاخیں ملک کے دور دراز علاقوں میں مسٹر امیر علی نے کھولیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے اسکول و کالج قائم کریں۔ جس سے مسلمان مذہبی اور اخلاقی تربیت بھی حاصل کر سکیں۔ بقول رام گوپال۔

"انھوں نے پوری کوشش سے پورے ملک میں تربیتی شاخیں قائم کرادیں۔ یہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں تھیں۔ جس میں مسلمانوں کے اکثریت کے علاقے بنگال، پنجاب کے علاوہ مدراس، بمبئی اور بہار قابل ذکر ہیں۔"[1]

ایک جگہ امداد صابری صاحب لکھتے ہیں۔

"پادریوں کے ذریعے سے عیسائی تحریک جو کہ اٹھارویں صدی

1۔ رام گوپال۔ انڈین مسلمز (انگریزی ایڈیشن۔ ص 49۔ ایشیا۔

سے برابر اپنا کام کر رہی تھی۔ حکومت کی سرپرستی میں اسے مزید
پھولنے کا موقع ملا۔ اس طرح مذہب اسلام پر کاری وار ہو
رہے تھے۔ پادری اپنے نئے حربوں سے ہندوستان کی غریب اور
پس ماندہ آبادی کو مادی وسائل کے بل بوتے پر عیسائیت
کی طرف کھینچ رہے تھے۔ انھوں نے حکومت کی سرپرستی اور
دولت کی فراوانی کے باعث مطابع قائم کر کے بائبل کی اشاعت
کے ساتھ ساتھ مختلف اخبار جاری کر رکھے تھے۔ جنھوں نے
عوامی ذہن کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ
مختلف مقامات پر اسکول، کالج اور مشنری ہسپتال کھول کر
اپنے مقاصد کی اشاعت کر رہے تھے۔ ان کے اخبار اور پریس
مسلمانوں کو مذہبی فنون کا مالک ثابت کرنے میں ڈٹے ہوئے تھے
وہ پوری کوشش سے یہ بات دنیا کو باور کرانے میں مصروف
تھے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ تلوار ہی کے زور سے اسلام پھیلایا ہے
اور وہ اپنی قوم کے سوا کسی کے ساتھ کھانا پینا بھی مذہباً
جائز نہیں سمجھتے ہیں۔ یہی وہ حربے تھے جن کے سبب انھیں
غیر مذہب بتایا جا رہا تھا اور اسلام کی صورت اس طرح مسخ
کر کے پیش کی جا رہی تھی کہ پوری دنیا کے سامنے مسلمانوں
کو وحشی ناخواندہ اور غیر مذہب ثابت کیا جائے"[1]

1۔ امداد صابری: فرنگیت کا جال۔ ص 25 1949ء دہلی۔

اس طرح کے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے جسٹس امیر علی نے انگریزی زبان میں اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھیں اور مختلف رسائل میں اسلام کے مسائل پر مضامین لکھے۔ بقول عبداللہ یوسف علی کے۔

"دوسری طرف اپنی تحریروں سے مسلمانوں کو اس طرف بھی متوجہ کیا کہ ان میں بے جا طور پر جو غیر اسلامی طریقے رواج پا گئے ہیں۔ ان سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ مثلاً شادی کے متعلق شریعت کے صحیح منشاء کو ملحوظ رکھیں کہ صرف ایک عورت سے نکاح کیا جائے۔ نیز اسلام اور دیگر علوم جدیدہ کے تحقیقی تعلق اور عورتوں کی حیثیت کو بھی پیش نظر رکھیں"[1]

مسلمانوں کو بیدار کرنے میں سرسید احمد خاں کی شخصیت سب سے اہم ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے گرد ایسے لوگوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ جنھوں نے قلمی جہاد سے اس فضاء کو صاف کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کی اصلاح کی۔ ان کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید احمد خاں تعلیم و اصلاح کے نہ صرف علم بردار تھے بلکہ علم برداروں کے رہنمائے اوّل تھے۔ انھوں نے اپنے مخلص ساتھیوں کی مدد سے مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر لگایا۔ اور ان کو احساس کمتری کے اندھیرے غار سے نکالا اور ترقی کی راہ دکھائی۔

سرسید احمد خاں نے 1866ء میں طعام اہل کتاب کے متعلق مضمون لکھ کر اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی جو مسلمانوں کی طرف سے

1۔ عبداللہ یوسف علی۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص 273 ہندوستانی اکیڈمی۔ الہ آباد 1933ء

اہل یورپ کے ساتھ مل کر کھانا کھانے پر کیئے جاتے تھے۔ اور اسی لئے انھوں نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان معاشرتی تعلقات قائم کرنے پر زور دیا۔ اور غلامی کے خلاف بھی مضامین لکھے۔ ایک انجمن "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے قائم کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کریں اور اپنے مقاصد و مطالب گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔ 1869 میں سرسید احمد خاں انگلستان گئے۔ وہاں رہ کر انگریزی تمدن سے واقفیت حاصل کی۔ انھوں نے "خطبات احمدیہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

1870ء میں سرسید احمد خاں نے "تہذیب الاخلاق" کا اجراء کیا۔ اس رسالے نے نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت کو جدید اصولوں پر ڈھالنے کی کوشش کی۔ سرسید نے اپنی محنت اور لگن سے ایسے رفقاء کار تیار کر لئے تھے۔ جنھوں نے قوم کی ذاتی خرابیوں کو دور کرنے، مذہبی تنگ نظری کو ختم کرنے اور جدید تقاضوں کے ساتھ زندگی کے مسائل حل کرنے کا ذمہ اپنے سر لیا۔ انھوں نے اسی سال بنارس میں "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" قائم کی۔

1878ء میں سرسید وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بنے اور 1883ء تک رہے۔ انھوں نے قانون انتقال جائداد، قانون حق استفادہ، قانون ترمیم فوجداری، قانون لوکل سیلف گورنمنٹ کے پیش ہونے پر کونسل میں پر زور تقریریں کیں۔ 1882ء میں جب سرسید احمد خاں کونسل کے ممبر

تھے تو ان کی شہادت ایجوکیشن کمیٹی میں لی گئی۔ 1883ء میں انھوں نے "محمڈن سول سروس ایسوسی ایشن" اس غرض سے قائم کی کہ اس کے چندے سے مسلمان لڑکوں کو انگلستان بھیجا جائے اور سول سروس کے مقابلہ جاتی امتحان یا وہاں کی کسی ڈگری حاصل کرنے میں مدد کی جائے۔ "محمڈن ایجوکیشن کانفرنس" اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑی تعلیمی انجمن تھی۔ اس انجمن کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوئی۔

سرسید احمد خاں نے انگریزوں کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ان کے خیال میں انگریزوں سے دشمنی یا مخالفت یا جنگ نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حکمران طبقے کی طرف سے مسلمانوں پر زیادتیاں ہو رہی تھیں۔ اس لئے انھیں ڈر تھا کہ اگر جوش کے مظاہرے کئے گئے تو قوم کو نقصان ہو جائے گا۔ وہ ایک عملی انسان تھے اور وقت کے تقاضے کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ نئی زندگی کے لئے ہر طرح سے جدوجہد، ملازمت کے ساتھ ساتھ خود بڑھنے کا شوق اور اس کے ساتھ اہل علم کی مالی پریشانی اور علم کا فقدان اور دورِ جدید میں حاکم قوم کا غلبہ۔ ان تمام باتوں نے ان پر دو چیزیں واضح کر دی تھیں۔ ایک یہ کہ علم حاصل کرنے کے لئے پوری لگن ضروری ہے۔ دوسری یہ کہ انگریزوں سے جنگ کرنا اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے۔ اور آئندہ نسل کی تباہی یقینی ہے۔

سرسید احمد خاں نے "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے مسلمانوں کی اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کو بے جا بحث و تکرار

اور بیکاری دسمنوں سے نجات دلائی ۔ اپنے مستقبل کی بہتری سے غافل ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لینا ان کے خیال میں ایک قومی گناہ تھا ۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کے خواہش مند تھے ۔ جو کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر زمانے کے نئے تقاضوں سے نباہ کر سکے ۔ ان کے پیش نظر سب سے اہم مسئلہ جدید تعلیم کا تھا ۔ وہ چاہتے تھے مسلمان جلد سے جلد نئی تعلیم حاصل کر سکیں اور حکومت میں حصہ لیں ۔ اور دوسری قوموں سے قدم ملا کر چلیں ۔ اس مقصد کے حصول کے لئے 1875ء میں ایم ۔ اے ۔ او کالج کا سنگ بنیاد رکھا ۔

ان پر مغرب پرستی کا الزام لگا کر ان کے لگائے ہوئے پودے کے میٹھے پھل سے بھی انکار کر دیا جائے تو اس کا کیا علاج ہے ۔ لیکن یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ وہ نئی بنیادوں پر نئی مشرقیت کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے تھے ۔ بقول آل احمد سرور ۔

"سرسید نے اپنی نسل کے افق ذہن کو وسیع کیا ۔ عقلیت اور قومی اخلاق کی استواری کا پرچار کیا ۔ انھوں نے تعلیمی جدوجہد کو سب سے اہم مان کر دوسری ضروریات کو اس کے تابع کر دیا ۔ ان کے اثر سے ایسے نوجوان سامنے آ گئے جو اپنی تہذیبی بنیادوں پر نئی مشرقیت کی تعمیر کر سکتے تھے ۔ انھوں نے مولانا شبلی کو علامہ شبلی بنایا ۔ سجاد حیدر یلدرم ، ظفر علی خاں ، ڈاکٹر عبدالحق طفیل احمد ، مولانا محمد علی ، سید محفوظ علی ، مرزا بشیر الدین ، شیخ عبداللہ وغیرہ ہر ایک کو ایک جذبہ ، ایک دھن ، ایک تعمیری

لگن دی۔ علی گڑھ کی ساری روایات ایم اے او کالج کی عطا کردہ ہیں۔ یونیورسٹی ان میں کوئی قابل قدر اضافہ نہ کر سکی"[1]

ایک جگہ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔

"اس لیے یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ تحریک دراصل علمی روح کی توسیع و اشاعت کا نام ہے۔ جو علی گڑھ تحریک کے علم بردار سرسید اور ان کے رفقاء نے انجام دیا"[2]

سرسید احمد خاں کی ادبی و علمی تحریک نے جس کی ابتدا سائنٹیفک سوسائٹی سے ہوئی تھی۔ ان سب رجحانات کو بدل ڈالا اور ایک ایسے علمی مذاق کی بنیاد ڈالی جو کہ ایک طرف حقیقت اور سچائی کی لگن تھی اور دوسری طرف افادیت اور مقصدیت کا علم بردار بھی تھا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ۔

"سرسید کی پیدا کی ہوئی لہر قید مقامی سے آزاد ہو کر پورے ملک میں پھیل گئی۔ ان نامور ہستیوں کی فہرست طویل ہے جنھیں ہم علی گڑھ تحریک کے اہم ارکان قرار دے سکتے ہیں۔ ان نامور افراد کی فہرست میں پہلے سلسلے میں نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولوی نذیر احمد، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاءاللہ، نواب عماد الملک، عبدالحلیم شرر ہیں۔ ان کے بعد دوسرا سلسلہ جو سامنے آتا ہے۔ ان میں نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر سر ضیاءالدین، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں

1۔ آل احمد سرور۔ ادب اور نظریہ۔ ص 218 ۔ 1954ء لکھنؤ

2۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ

مولوی عبدالحق، مولوی طفیل احمد، مولانا ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم، مولوی عزیز مرزا، مولانا عنایت اللہ اور مولانا مسرت موہانی وغیرہ"[1]

دوسرے سلسلے میں جو نئی تبدیلیاں عمل میں آئیں وہ پہلے سلسلہ کی تبدیلیوں سے بہت ہی مختلف تھیں۔ لیکن سرسید احمد خاں کو انگریزوں کے بلند نقطہ نظر اور روایت پسندی کے سبب جو امیدیں تھیں وہ پوری نہیں ہو سکیں۔ 1884ء میں انھیں انگریزوں سے شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ مسلمانوں سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ اس لئے وہ اس توہین آمیز رویے کو بہت محسوس کرنے لگے تھے۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی۔

"شروع شروع میں وہ انگریزوں کی شرافت اور دیانت پر اس قدر بھروسہ کر بیٹھے تھے کہ انھیں امید تھی کہ انگریز مسلمانوں کو اپنی تجارت میں حصہ دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے اور یہی خیال سرکاری ملازمتوں کے متعلق بھی تھا۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرا جدید تعلیم نے مسلمانوں کو سیاسی معاملات پر غور کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ وہ آخر اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اب تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسی نصب العین کے حاصل کرنے کی سخت ضرورت ہے"[2]

یہی خیالات تھے جو سرسید کے ذریعے نئی نسل نے حاصل کئے اور جنگ آزادی کے بعد جو نفرت پیدا ہوئی اس کو محسوس کرنے والے بھی علی گڑھ کی فضا

1۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ ص 57 1960ء لاہور

2۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ حیات جاوید۔ ص 572

میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد نئے جوش کے ساتھ ابھرنے والے نوجوان ہی تھے
ان نوجوانوں میں تین نام ایسے ہیں جنھوں نے ایک مدت تک اس مقصد کو
حاصل کرنے کے لئے عملی میدان میں مسلسل اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ جن
میں ایک مولانا محمد علی دوسرے مولانا ظفر علی خاں اور تیسرے حسرت موہانی
تھے۔ ان میں مولانا محمد علی جوان میں ہی چل بسے تاہم وہ جب تک زندہ
رہے۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے برابر کوشش کرتے رہے۔ حسرت موہانی
اور مولانا ظفر علی خاں کو ملک کی خدمت کے طویل مواقع ملے۔ حسرت موہانی
کی شخصیت کی سچائی اور خلوص ان کا کردار اور ان کی قربانی سے بھری زندگی
مسلمانوں کے لئے ایک درسِ نصیحت ہے۔ لیکن مولانا ظفر علی خاں نے قلم کی مدد
سے یہ جنگ لڑی۔ انھوں نے قید و بند کی تکلیفیں بھی برداشت کیں۔ اور عملی
میدان میں دینی نتائج کے اعتبار سے ایک الگ شاہراہ اختیار کی۔ جس کی طرف
سرسید احمد خاں اشارہ کر چکے تھے۔ لیکن ان راہوں کو متعین کرتے اور دوسروں کو
راہ عمل کے لئے ان کو پورے طور سے مواقع نہیں مل سکے تھے۔ اس لئے ایک جگہ
انھیں کہنا پڑا۔

"انگریزوں کا جو سلوک اپنے ہم قوموں سے اور جو ہندوستانیوں
سے ہے اس میں اتنا ہی فرق ہے جتنا سفید اور سیاہ
میں"[1]

1۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: سرسید اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ ص۔ 57 1960ء لاہور۔

1530ء کے قریب دریائے جہلم کے کنارے ایک خاندان بسا ہوا تھا۔ اس خاندان کے سردار راجا ملک درویش خان تھے۔ راجا ملک درویش خان کے پردادا بھیم دیو ایک ہندو راجپوت تھے۔ راجا ملک درویش کے دادا صاحب خان نے ہندو مذہب ترک کر دیا اور اسلام قبول کر لیا تھا۔ جب راجا ملک درویش کا انتقال ہوا تو بیٹوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ ان کے ایک بیٹے نصیر خان نے اس خیال سے گھر بار چھوڑ دیا۔ کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آپس میں جھگڑا ہو۔ ان کے اندر جذبہ جرأت و شجاعت موجود و برقرار تھا انھوں نے اپنی دنیاوی زندگی کا سامان از سر نو پیدا کیا۔ اور دریائے چناب کے کنارے نصیر آباد نام سے ایک بستی آباد کی۔ ابھی یہ اچھی طرح سے آباد بھی نہیں ہوئے تھے کہ دریائے چناب کی طغیانی نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس طرح سے ایک بار پھر ان کی اولاد آبائی وراثت سے محروم ہو گئی۔

اس خاندان کے افراد نے کئی مرتبہ مختلف مقامات پر گاؤں آباد کئے مگر کہیں بھی آرام سے نہیں رہے۔ پنجاب میں سکھوں نے پریشان کیا تو ہر فرد نے اپنی حفاظت کے لئے اپنے اپنے گاؤں میں گڑھیاں بنائی تھیں۔ پھر بھی سکھوں کی دہشت گردی میں محمد حسن خان کے والد (احمد خان) خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ شہید ہو گئے۔ اس وجہ سے محمد حسن کی والدہ اپنے یتیم بچے کو لے کر بھاگیں۔ انھوں نے ضلع گوجرانوالہ میں پناہ تلاش کی۔ اور اسی جگہ پر اپنے بچے کی پرورش کی۔ اس کے بعد یہ خاندان کوٹ مہر نور تحصیل وزیر آباد میں منتقل ہو گیا۔

محمد حسن خاں کے تین بیٹے ہوئے جن میں سے ایک مولوی کرم الٰہی (مولانا ظفر علی خاں کے دادا) نے عربی و فارسی میں کافی دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد مشن اسکول صدر بازار سیالکوٹ میں فارسی و عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ اسی دوران ملازمت ایک بنگالی استاد نے ان سے معاوضہ پر فارسی اردو پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تو مولوی صاحب نے فرمایا۔

"میں آپ سے فارسی اردو پڑھانے کا معاوضہ نقدی کی شکل میں نہیں لینا چاہتا۔ میرا معاوضہ صرف یہ ہے کہ آپ اس کے بدلے میرے بیٹے سراج الدین احمد کو انگریزی پڑھا دیں۔ چنانچہ بنگالی استاد نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اور مولوی سراج الدین احمد نے خصوصی طور پر اسکول کے علاوہ بنگالی استاد سے انگریزی پڑھی مولوی صاحب (کرم الٰہی) اپنے زمانے میں نامور استاد تھے اور افسران بالا نے ان کا ذکر نہایت اچھے انداز میں کیا"[1]

مولوی کرم الٰہی کی محنت اور دور اندیشی سے اس خاندان کی مالی حالت بھی بہتر ہو گئی تھی۔ اور اپنی کفایت شعار زندگی کے سبب اپنے آپ کو محدود کر لیا تھا۔ جب وہ سیالکوٹ چھوڑ کر وزیر آباد میں آباد ہوئے تو انھوں نے شہر سے باہر موضع دنجوال کے قریب ایک وسیع قطعہ زمین خرید کر اس میں دو پختہ کنوئیں تعمیر کرائے اور اپنے رہنے کے لئے کچی اینٹوں کا ایک بڑا مکان بھی بنایا۔ اس آبادی کا نام کرم آباد تجویز کیا۔ مولوی کرم الٰہی

1۔ چودھری غلام حیدر: زمیندار گولڈن جوبلی نمبر 1953ء

نے 1890ء میں انتقال کیا اور اپنے باغ میں دفن ہوئے۔

مولوی سراج الدین احمد فتو منڈی ضلع گوجرانوالہ 19 جنوری 1850ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت اپنے والد کی زیر نگرانی ہوئی اور اسی اسکول میں تعلیم پائی جہاں پر ان کے والد استاد تھے۔ میجر فلر ڈائریکٹر تعلیم نے جب اسکول کا معائنہ کیا تھا تو مولوی سراج الدین احمد (طالب علم تھے) کے متعلق یہ لکھا تھا۔

"یہ لڑکا نہایت ہشیار ہے اور مدرس اول (مولوی کرم الٰہی) کا بیٹا مدرسہ کا زیور ہے"[1]

اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی سراج الدین احمد نے اپنے والد کے زیر نگرانی میں کس طرح تعلیم و تربیت حاصل کر رہے تھے۔ کیونکہ مولوی کرم الٰہی قناعت پسند، صاف گو اور سیدھے مسلمان تھے۔ یہی چیزیں وراثت میں مولوی سراج الدین احمد کو بھی ملی۔

اکتوبر 1867ء کا مہینہ تھا مولوی سراج الدین احمد کی عمر 17 سال کی تھی۔ اپنی والدہ سے دال کھانے کھانے اکتا جانے کا ذکر کیا۔ جب یہ بات ان کے والد کو بتائی تو انھوں نے متانت سے جواب دیا۔

"یہاں تو دال ہی پکا کرے گی اگر اسے گوشت کھانا ہے تو اپنا انتظام خود کرنا چاہیئے"[2]

اس بات نے مولوی سراج الدین احمد کے دل پر اثر کیا۔ والدہ سے ایک روپیہ

1۔ زمیندار۔ ہفتہ وار۔ جلد 8۔ ص 13۔ خود نوشت سوانح عمری مولوی سراج الدین احمد۔ 1910ء

2۔ ایضاً۔

لیا اور اجازت لے کر اپنے گاؤں سے چل پڑے۔ پھر منشی عزیز الدین
وکٹوریہ پریس گوجرانوالہ کے یہاں ملازم ہوئے۔ اس کے بعد کچھ دنوں
تک راجہ موتی سنگھ کے پاس جو کہ سیالکوٹ میں تھا۔ ان کے بچّوں کے
اتالیق رہے۔ لیکن یہ ملازمت بھی عارضی ثابت ہوئی اور اس کے بعد انھیں
محکمہ ڈاک میں ملازمت مل گئی اور اسی محکمہ سے انھوں نے پنشن لی۔ ان
کی طبیعت میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انھوں نے انگریزوں
کی ملازمت کے دوران بھی اپنی خودداری اور عزت نفس پر کوئی بھی
حرف نہیں آنے دیا۔ اس سلسلے میں خود مولوی سراج الدین احمد کے
صاحبزادے چودھری غلام حیدر لکھتے ہیں۔

"والد صاحب مرحوم مختلف مقامات پر پوسٹ ماسٹر کے عہدے
پر فائز رہے۔ کسولی کا واقعہ ہے کہ ایک اتوار کو ڈاک خانہ
بند تھا۔ ایک گورے سارجنٹ نے ڈاک خانہ کے برآمدہ
میں پہنچ کر کہا "بابو! ہمر چھٹی دجسٹری کرانا مانگتا" مولوی
صاحب (سراج الدین احمد) نے جواب دیا "آج ڈاکخانہ بند
ہے۔ دجسٹری نہیں ہو سکتی" گورے سارجنٹ نے کہا "یو۔ڈیم"
یہ سنتے ہی انھوں نے ڈاک خانے کے چپراسیوں کو ڈاک خانہ
کھولنے کا حکم دیا۔ جب سارجنٹ یہ سمجھا کہ میری چھٹی دجسٹری
ہونے والی ہے۔ ڈاک خانہ کے کمرے میں داخل ہوا تو انھوں
نے چپراسیوں کو حکم کہ دول سے گورے کی خوب مرمت کی جائے

جب دو دن سے اس کی تواضع ہو گئی تو مولوی صاحب نے اس سے کہا۔ "لو۔ ڈیم" نکل جاؤ۔ تمہاری چھٹی ہو گئی۔ دوسرے دن شام کو مولوی صاحب سڑک کے کنارے جا رہے تھے۔ تو اتفاق سے اس گورے سارجنٹ نے انھیں پہچان لیا۔ اور دیکھتے ہی بولا "آؤ ہم دوستی کریں"۔ مولوی صاحب نے اس سے ہاتھ ملایا اور وہ ہنستا ہوا چلا گیا"[1]

یہ مولوی سراج الدین احمد کے والد کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ بے حد پابند شرع تھے۔ اور برائی سے بہت دور رہتے تھے۔ وہ جس زمانے میں کھوالی میں تھے تو۔

"ایک اتوار کو ریلوے سٹیشن کے ہندو سٹیشن ماسٹر نے ڈاکٹر پرمانند اور ایک دو صاحبان کی دعوت کی یہ بھی مدعو تھے جب شراب کا دور شروع ہوا تو حاضرین بالخصوص میزبان اور ڈاکٹر پرمانند نے اصرار کیا۔ انھوں نے پیشاب کا بہانہ کیا اور اپنے بیٹے (غلام حیدر خاں) کو ساتھ لے کر باہر چلے آئے"[2]۔

مولوی سراج الدین احمد چونکہ اپنے محکمہ میں ملازم تھے۔ جس پر اس زمانے میں غیر مسلم افراد مسلط تھے۔ اس لئے ان کی تقریر میں مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب کا بیان ضرور ہوتا اور وہ اس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ "جب تک مسلمان اپنے علم کے اعتبار سے ہندوؤں کے برابر نہیں

1۔ زمیندار۔ گولڈن جوبلی نمبر فروری 1953ء لاہور

2۔ ایضاً۔

ہو جانے اور اس صلاحیت کی بنا پر سرکاری ملازمتوں میں اپنا
مناسب حصہ حاصل نہیں کر لیتے۔ ان کی معاشرتی ترقی ایک ایسا
خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا"[1]

ان کی باتوں سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی تھی کہ پنجاب کے زمیندار جو اس
صوبے کے معاشرتی نظام میں بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ جب تک علم سے
عروم اور سرکاری دربار میں عزت حاصل کرنے کے وسائل سے عاری رہیں گے
تو پنجاب کا صوبہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے دوش بدوش ترقی پر
نہیں چل سکتے۔

جب مولوی سراج الدین احمد ریاست کشمیر میں ملازمت پر تھے تو 1898ء
میں اودھ کی سرزمین سے اردو زبان کی مخالفت کا طوفان اٹھا۔ پنجاب بھی
اس سے متاثر ہوا۔ 1899ء میں نواب محسن الملک نے اردو تحریک شروع کی
آخر کار اس عہد کے ارباب حکومت نے فیصلہ کیا کہ ہندی اردو کی مقبولیت کا
جائزہ لیا جائے اور طریقہ کار یہ طے پایا کہ "ہندوستان کے محکمہ رسل و رسائل
کے ذریعے سے ان خطوط کے اعداد شمار فراہم کئے جائیں۔ جن کے پتے
ان دونوں زبانوں میں لکھے جاتے ہیں۔

مولوی سراج الدین احمد اس زمانے میں کشمیر میں تھے
جب وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوئے تو انھوں نے اپنے روز و
شب اسی کام کے لئے وقف کر دیئے کہ مسلمان اپنے خطوط کے

1۔ محمد طفیل، نقوش، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم ص 1355 لاہور

پتے اردو زبان میں لکھیں۔ یہ تحریک انھوں نے پنجاب میں پہنچائی
اور اس پیغام کو ہر جگہ پہنچایا کہ خط انگریزی میں لکھا جائے
یا اردو زبان میں مگر لفافے پر پتے اردو زبان میں لکھیں۔ اور
مسلمان اپنا فریضہ سمجھ لیں کہ خط لکھنے کی ضرورت ہو یا نہ ہو
کم از کم چھ مہینے تک بے شمار خط لکھیں اور پتے لکھتے وقت
اسی قومی فریضے کو ملحوظ رکھیں"[1]

مولوی سراج الدین احمد کا یہ کارنامہ اردو زبان کی بقا و استحکام کے
لئے ایک قابل ذکر کارنامہ رہا۔ ان کو شاعری کا ذوق بھی ابتدائی عمر سے
تھا اور یہ ذوق ان کی رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ اس لئے وہ لکھتے ہیں۔

"مجھے ابتدائی عمر ہی سے شعر و شاعری کا شعور تھا۔ ابھی میری عمر
دس سال کی تھی کہ ایک دن والد بزرگوار کے ایک دوست
کو مثنوی گلزار نسیم کی تعریف کرتے سنا۔ اسی اثنا میں میرے
دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ اس مثنوی کو فارسی میں لکھوں
چنانچہ میں نے پکا ارادہ کر لیا اور اس کی ابتدا بھی کر دی۔
تقریباً سو شعر لکھے ہوں گے کہ ایک دن جب میں فکر شعر میں
متفرق تھا کہ والد بزرگوار سر پر آ کھڑے ہوئے۔ مجھے ان
کے اس طرح اچانک آنے کی مطلق خبر نہ ہوئی اور وہ کھڑے
دیکھتے رہے۔ آخر انھوں نے پوچھا کہ "یہ عربیت کیسی ہے؟" میں

1۔ حکیم احمد شجاع (انٹرویو) و چودھری غلام حیدر: گولڈن جوبلی نمبر زمیندار
1953ء

آواز سن کر تعظیم کے لئے کھڑا ہوا۔ والد صاحب نے فرمایا "یہ شاعری تمھیں لے ڈوبے گی اور دین و دنیا سے گنوا دے گی" یہ کہہ کر جو اوراق لکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے اٹھا کر پارہ پارہ کر دیئے اور آئندہ کے لئے عہد لیا کہ شعر گوئی کا خیال تک دل میں نہ لاؤں گا"[1]

مولوی سراج الدین احمد کی پنشن کا آخری زمانہ کسالوں کی سخت بے چینی کا زمانہ تھا اس بے چینی کو دور کرنے کے لئے انھوں نے ایک اخبار جنوری 1903ء میں "زمیندار" کے نام سے نکالا۔ جو کہ اس کے ذریعے وہ غریب زمینداروں کی آواز حکومت تک پہنچا سکیں۔ اپنی محنت اور لگن سے اس اخبار کو وہ اپنے آخری وقت 1909ء تک نکالتے رہے۔

قوم کے اس خادم نے تین مہینے کی بیماری کے بعد 6 دسمبر 1909ء کو 59 برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی خدمت کو اس برصغیر کی سیاسی، ادبی، صحافتی تحریک کا ذکر کرنے والے فراموش نہیں کر سکتے۔

مولوی سراج الدین احمد نے دو شادیاں کیں۔ ان کی پہلی بیگم سے تین لڑکے پیدا ہوئے۔ ظفر علی خاں، غلام حیدر خاں اور محمد اکبر علی خاں، دوسری بیگم سے پروفیسر محمود احمد خاں، مولانا حامد علی خاں اور پروفیسر حمید احمد خاں دو لڑکیاں۔ حمیدہ بیگم اور زہرہ بیگم۔ مولوی سراج الدین احمد کی زندگی سے ان کی بے تعصبی، راست بازی، مستقل مزاجی اور اصول کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔

1۔ زمیندار ہفتہ وار۔ مولوی سراج الدین احمد۔ خود نوشت سوانح عمری 1910ء کرم آباد

انھوں نے اپنی زندگی کو بنایا اور اپنے بلند کردار سے اچھی زندگی کا نمونہ پیش کیا۔ اپنی اولاد سے انھیں جس بات کی اُمید تھی وہ پوری ہوئی۔ کیونکہ ان کی اولاد میں ہر فرد نیک اور صالح بنا۔ ان کے بڑے بیٹے مولانا ظفر علی خاں نے باپ کی توقعات کو پورا کر کے دکھایا۔

زندگی کے نشیب و فراز

مولانا ظفر علی خاں موضع ہرتہ ضلع سیالکوٹ 17 جنوری 1873 کو پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کی تاریخ کے بارے میں اختلاف رائے ہے

مولوی محمد عبداللہ قریشی کے مطابق۔

"مولانا ظفر علی خاں کی ولادت 1870ء (1290ھ) ہے" 1

اشرف عطا کے مطابق۔

"ولادت 1290ھ (انگریزی تاریخ کا تعین نہیں ہے)" 2

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے مطابق۔

"ولادت 1873ء / 1290ھ ہے" 3

نامہ نگار "زمیندار" کے مطابق۔

"ولادت 1871ء کی ہے" 4

عنایت اللہ خاں کے مطابق۔

"ان کی ولادت 17 جنوری ہے اور ان کی سال گرہ کرم آباد میں 17 جنوری کو منائی جاتی ہے" 5

1۔ نقوش۔ آپ بیتی نمبر ص 731۔ اکتوبر 1956ء۔
2۔ اشرف عطا۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 22 لاہور۔
3۔ زمیندار۔ 14 جون 1924ء لاہور۔
4۔ مولانا ظفر علی خاں بحیثیت ادیب و شاعر ص 590 1967ء لاہور۔
5۔ عنایت اللہ خاں۔ مدبر قریت جلد 1۔ شمارہ 5۔ 16 اپریل 1923ء لاہور

مولوی سراج الدین احمد کے سب سے بڑے بیٹے مولانا ظفر علی خاں تھے۔ گھر والوں نے ان کا نام خداداد رکھا۔ اور گھر کے بزرگ دادا مولوی کرم الٰہی نے ان کا نام ظفر علی خاں رکھا۔ جب مولانا ظفر علی خاں گھر کی چار دیواری سے باہر نکلے تو اسی نام سے مشہور ہوئے۔

"یہ زمانہ مولوی سراج الدین احمد کی سرکاری ملازمت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ وہ ملازمت کے سلسلے میں اکثر وطن سے باہر رہتے۔ اس لئے ظفر علی خاں کے ایام طفولیت اپنے دادا کی سرپرستی میں گزرے اور ان ہی کی شفقتوں کے سایہ میں بچپن کی منزلوں کو طے کرتے رہے۔ زمانے کے حالات کے مطابق پہلے انھیں قرآن مجید کی تعلیم دی گئی۔"[1]

مولانا ظفر علی خاں کی ابتدائی تعلیم مشن اسکول وزیرآباد میں ہوئی۔ لیکن ان کے دادا (مولوی کرم الٰہی) نے اس مخصوص تعلیمی ماحول کو پسند نہیں کیا۔ اور علی گڑھ بھیج دیا۔ چھٹی جماعت تک علی گڑھ میں رہے اور اس کے بعد واپس آ گئے۔ آٹھویں جماعت کا امتحان مشن ہائی اسکول وزیرآباد سے پاس کیا۔ ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں ایک بیان یہ ہے کہ

"انھوں نے مڈل تک تعلیم مشن ہائی اسکول وزیرآباد سے حاصل کی اسی دوران انھیں علی گڑھ مدرسہ میں بھیجا گیا تھا۔ لیکن وہ کچھ عرصے وہاں رہ کر واپس چلے آئے اور مڈل کا امتحان

1۔ زمیندار۔ خود نوشت سوانح عمری۔ مولانا ظفر علی خاں اپریل 1928ء لاہور۔

مشن اسکول وزیر آباد سے پاس کیا۔ اس کے بعد ان کو ان کے
پھوپھا کے پاس پٹیالہ بھیج دیا گیا"[1]

دوسرا بیان خود مولانا ظفر علی خاں کا ہے:-

"میں نے بچپن میں مشن اسکول میں تعلیم پائی۔ پانچویں چھٹی
علی گڑھ سے پاس کی۔ آٹھویں مشن ہائی اسکول وزیر آباد سے
پھر نویں پٹیالہ سے اور میٹرک کا امتحان الہ آباد و پنجاب
ہر دو یونیورسٹی سے پاس کیا"[2]

اس کے بعد مولانا ظفر علی خاں گجرات چلے آئے اور اپنے والد کے ساتھ رہے۔
یہاں ان کے والد محکمہ ڈاک میں ملازم تھے جب یہاں سے والد کا تبادلہ
ہو جانے کے بعد بھی مولانا موصوف گجرات میں رہے اور یہاں کے ماحول
کا ان کے اوپر اچھا اثر پڑا، یہ اثر ان پر ہمیشہ قائم رہا۔ جب مولانا ظفر علی
خاں جنگ بلقان کے جلسے کے سلسلے میں گجرات آئے تو انھوں نے اسی
جلسے میں کہا۔

"یہ فخر شیخ کرامت اللہ کے خاندان کو حاصل ہے کہ جب
میرے والد کی تبدیلی ہوئی تو اس خاندان نے مجھے اپنے
گھر رکھا"[3]

اس کے علاوہ جب وہ تقریر کرتے تھے تو یہ ضرور کہتے تھے کہ۔

1۔ زمیندار۔ گولڈن جوبلی نمبر جنوری 1953ء لاہور
2۔ نقوش۔ آپ بیتی نمبر ص 732 لاہور
3۔ ایضاً۔

"گجرات کی علمی و ادبی سوسائٹی نے میری زندگی پر بچپن ہی سے اثر ڈالا ہے۔ اور یہ اثر شیخ خانون گولیوں کے خاندان سے حاصل کیا"[1]

ایک جگہ عنایت اللہ خاں لکھتے ہیں۔

"مولوی سراج الدین احمد کو ان کی تربیت کا خاص طور سے خیال تھا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی سبق آموز حکایت بیان کرتے تھے مولانا ظفر علی خاں اس کو سنتے دیتے تھے۔ جب حکایت ختم ہوتی تو مولانا سے کہتے کہ کھڑے ہو کر انگریزی میں بیان کرو۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان کو انگریزی تقریر میں بھی مشق ہو جائے۔ اس کے علاوہ ان کی فارسی تعلیم بھی جاری تھی۔ اور آپ دیوانِ حافظ (ظفر علی خاں) پڑھایا کرتے تھے"[2]

مولانا ظفر علی خاں کی عمر بقول خود بارہ سال کی تھی تو ان کی شادی ہو گئی۔

"مولوی سراج الدین احمد کے سمدھی ظفر علی خاں کے دادا (مولوی کرم الٰہی) کے پاس آئے اور اپنے قدیمی تعلق کے سبب اپنی لڑکی کا عقد مولانا ظفر علی خاں سے کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ کیونکہ وہ اس رشتہ کو اپنی لڑکی کے لئے بہتر سمجھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے مولوی کرم الٰہی کو ہم خیال بنا لیا۔ مولوی کرم الٰہی

1۔ زمیندار، اپریل 1928ء لاہور

2۔ عنایت اللہ خاں۔ مدیر اخبار وریت ہفتہ وار 16 اپریل 1922ء لاہور

نے اپنے عزیز کی اس خواہش کو خلوص و محبت کے ساتھ پورا کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اور اس خیال کے پیش نظر انھوں نے اپنے بیٹے مولوی سراج الدین احمد پر زور دیا۔ چونکہ وہ اطاعت گزار اور سعادت مند تھے۔ انھوں نے اپنے باپ کے آگے سر تسلیم کر دیا۔ لیکن اپنی ڈائری میں جو الفاظ انھوں نے تحریر کئے اس سے ان کی شدید ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے"۔[1]

"میں نے اپنے باپ کی فرمانبرداری میں ہی یہ ایک قربانی کی ہے"۔[2]

مولانا ظفر علی خاں خود لکھتے ہیں کہ۔

"میری شادی بارہ برس کی عمر میں ہو گئی تھی۔ جب بیوی گھر میں آئی میں ایک مدت تک یہ سمجھتا رہا کہ یہ کوئی مہمان لڑکی آئی ہوئی ہے۔ یہ لڑکی اپنے گھر کیوں نہیں جاتی"۔[3]

مولانا ظفر علی خاں کو میٹرک کے بعد ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ علی گڑھ سے 1893ء میں ایف۔ اے کا امتحان دیا اور اپنے والد کے پاس کشمیر چلے گئے وہ خود لکھتے ہیں۔

"علی گڑھ کالج سے ایف۔ اے پاس کر کے کشمیر چلا گیا۔ جہاں میرے والد سررشتہ ڈاک کے اعلیٰ افسر تھے۔ اور کچھ عرصہ

1۔ زمیندار۔ گولڈن جوبلی نمبر۔ جنوری 1953ء لاہور

2۔ ایضاً۔

3۔ نقوش آپ بیتی نمبر ص 734 حصہ اول جون 1964ء لاہور

کے لئے انھیں کی ماتحت اس سررشتہ میں ملازم ہوگیا"[1]

مولانا ظفر علی خاں کے والد ان کو اعلیٰ عہدے پر دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ اس لئے ان کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ لیکن ظفر علی خاں ملازمت پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ آزاد رہنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ اپنے ذہن کو ملازمت کی طرف تیار نہیں کر سکے۔ ان کا بیان ہے کہ۔

"والد مرحوم کی خواہش تھی کہ مجھے پنجاب میں کسی بلند سرکاری منصب پر سرفراز دیکھیں۔ کشمیر کے دیوان بہادر ان دنوں کرنل پریڈو (Perado) تھے۔ جو ان کے حال پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ نیز انجہانی دائے بھاگ مل وزیر عدالت کشمیر کے ساتھ بھی ان کے تعلقات نہایت اچھے تھے۔ والد مرحوم کی خواہش پر انجہانی دائے بھاگ مل نے سفارش کی کہ مجھے پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا عہدہ عطا کیا جائے۔ کرنل پریڈو نے اس سفارش کو اپنی زبردست تائید کے ساتھ پنجاب گورنمنٹ کے پاس بھیج دیا۔ اور وہاں سے میرا نام اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے امیدواروں کے زمرے میں شامل کر لینے کی اطلاع موصول ہوئی"[2]

اس کے باوجود مولانا ظفر علی خاں انگریزی ملازمت کو سخت ناپسند کرتے تھے اور انھوں نے اپنے دل میں سوچ لیا تھا کہ میں انگریزوں کی ملازمت

1۔ نقوش آپ بیتی نمبر ص 734 حصہ اول جون 1964ء لاہور

2۔ زمیندار روزنامہ 28 اپریل 1928ء لاہور

نہیں کرونگا وہ لکھتے ہیں۔

"میرے لئے یہ بالکل آسان تھا کہ خدمت موجودہ جس کے لئے امتحان مقابلہ کی شرط نہ تھی۔ محکمہ امتحان دے کر حاصل کر لیتا اور آج اپنے معاصرین میاں فضل حسین یا ڈاکٹر اقبال کی طرح ترقی کرتے کرتے یا تو سر ہو گیا ہوتا یا حکومت کی وزارت یا کم از کم عدالت عالیہ کی جج کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہوتا۔ لیکن میری طبیعت، انگریزوں کی خدمت کے ننگ سے نفور تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ نوکری کروں گا بھی تو کسی اسلامی ریاست میں والد صاحب سے میں نے عرض کیا کہ مجھے بی۔ اے پاس کر لینے دیا جائے۔ چنانچہ میں کشمیر کی ملازمت چھوڑ کر چلا آیا اور دو سال کے بعد بی۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہو کر یونیورسٹی میں تیسرے یا چوتھے نمبر پر رہا۔"[1]

مولانا ظفر علی خاں کے بی۔ اے کے امتحان میں پاس ہونے کی مختلف رائیں ہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں۔

"1890ء میں ڈگری لی"[2]

محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں۔

"1891ء میں علی گڑھ جا کر بی۔ اے کی سند لی"[3]

1۔ نقوش۔ آپ بیتی نمبر ص 733 جون 1964ء لاہور
2۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ ظفر علی بحیثیت ادیب و شاعر 1967ء لاہور
3۔ محمد عبداللہ قریشی، ظفر و مزاح نمبر ص 778۔ 1959ء لاہور

عنایت اللہ خاں لکھتے ہیں:۔

"1895ء میں آپ بی۔اے کے امتحان میں شامل ہوئے اور درجہ اول کے امتیازی نمبر کے ساتھ کامیاب ہوئے" 1

نرگس صادق صاحبہ کے مطابق۔

"مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر ضیاالدین اور ظفر علی خاں نے 1895ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا" 2

ڈاکٹر عبدالحق کا بیان ہے کہ:۔

"سید محفوظ علی نے مدرسۃ العلوم مسلمانان (ایم۔اے۔او کالج) میں تعلیم پائی۔ بی۔اے۔ میں سید صاحب، ظفر علی خاں، حافظ اکرام اللہ اور راقم الحروف سب ساتھ رہے۔ 1895ء میں تعلیم سے فارغ ہوکر اپنے وطن چلے گئے" 3

ایک جگہ ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں کہ:۔

"پرنسپل بیک نے ڈرل کے لئے رنگین اور ریشمی مخمل کا کپڑا تجویز کیا۔ اس ڈرل سے صرف سال آخر کی کلاس مستثنیٰ تھی اس پر کہا کہ ڈرل کے لئے اس تماشے کا کپڑا مناسب نہیں" 4

اس بات سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق کے ساتھ مولانا ظفر علی خاں بھی تھے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں نے بی۔اے کا امتحان

1۔ عنایت اللہ خاں۔ مدیر حریت ہفتہ وار اپریل 1926ء لاہور

2۔ نرگس صادق صاحبہ، محمڈن کالج (ڈائریکٹری) مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی اگست 1969ء

3۔ ڈاکٹر عبدالحق۔ مضامین۔ محفوظ علی بدایونی، انجمن ترقی اردو کراچی۔ 1969ء اگست

4۔ ایضاً

1895ء میں پاس کیا۔

مولانا ظفر علی خاں علی گڑھ میں تقریباً پانچ سال رہے۔ شروع کا ایک سال ابتدائی تعلیم کا زمانہ ہے۔ اور میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد بی۔ اے تک کا زمانہ چار سال ہے۔ یہی چار سال کا زمانہ ان کی زندگی کا وہ زمانہ ہے جس نے ان کو علی گڑھ کے ممتاز ترین طلباء کی صف میں کھڑا کیا۔ اس زمانے میں انھوں نے سرسید احمد خاں کو اچھی طرح سے دیکھا تھا۔ اور ان کی وہ بھی حالت دیکھی ہوگی جب وہ اسٹریچر پر ہال کے باہر زار و قطار روتے ہوئے دیکھے گئے جب ان سے معلوم کیا کہ آپ اس طرح سے کیوں رو رہے ہیں تو انھوں نے کہا کہ۔

"میں رو رہا ہوں کہ کیا اس تربیت کے لئے ان کے والدین نے انھیں یہاں بھیجا ہے۔ اور کیا اس نمونے کے لڑکے یہاں سے نکلیں گے گویا تمام محنتیں رائیگاں جائیں گی"[1]

ان تمام باتوں نے ان میں ایک شدید احساس پیدا کر دیا۔ انھیں اثرات کو لے کر مولانا ظفر علی خاں علی گڑھ آ گئے تھے۔ اور سرسید احمد خاں کے احسانات کو تمام عمر یاد کرتے رہے۔ بقول مولانا صلاح الدین:

"اس درس گاہ نے پروگراموں کی بجائے پروگرام بنانے والے پیدا کئے۔ وہ اپنے زمانے کے حالات کے مطابق اس عظیم خاکے میں رنگ بھرتے چلے گئے۔ جو فلاح ملت اسلامیہ ہند کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اور اس کا یہی منشائے نظر تھا۔ بیداری

---

1. جیون یار جنگ بہادر (چیف جسٹس حیدر آباد دکن) خطبہ تقسیم اسناد 1938ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

اور دہری کی لہریں جو یہاں سے منتشر ہوئیں۔ وہ برصغیر کے ہر گوشے میں پہنچ کر اثر آفریں ثابت ہوئیں۔ اس زمانے کا علی گڑھ ڈگری بنانے کی فیکٹری نہیں تھا" 1

مولانا ظفر علی خاں نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں پروفیسر آرنلڈ، ماریسن اور علامہ شبلی کی ذات بھی ایک عظیم شخصیت تھی۔ اس لئے ظفر علی خاں اپنے اساتذہ کو کبھی نہیں بھولے۔ خاص طور سے علامہ شبلی کا ذکر "استاذی و ملاذی پیرے مخدوم" کے الفاظ سے کیا ہے۔ اس کا وہ خود اعتراف کرتے ہیں ؎

یہ فیضِ صحبتِ علامہ شبلی کا تصدق ہے
کہ دنیائے ادب میں دھوم ہے میرے مقالوں کی 1

مولانا ہمیشہ اپنے اساتذہ کے احسانات خصوصاً علامہ شبلی کے احسانات کا ذکر کرتے رہے۔ علامہ شبلی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ۔

"انھوں نے بدلے ہوئے حالات میں جب قوم مغرب سے مرعوب ہو کر شدید ذہنی غلامی میں مبتلا ہو چکی تھی۔ ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا۔ جس میں ایک طرف قدیم و جدید کی خوش گوار آمیزش تھی۔ دوسری طرف علوم اسلامیہ کے احیاء کے ذریعے ملک میں ایک علمی و ذہنی انقلاب پیدا کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شبلی جب سے سرسید کے زیر اثر آئے تو انھیں محسوس

1۔ چمنستان۔ ظفر علی خاں۔ ص 18

ہوا کہ علماء شدید بے علمی اور بے خبری کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔"[1]

مقتدا احمد شیروانی ایک آگے لکھتے ہیں۔

"شبلی نے فراخ دلی سے مغربی علوم سے استفادہ کیا۔ وہ 1884ء میں اپنے بھائی (مہدی) کو علی گڑھ میں داخل کرانے گئے تھے۔ وہاں سرسید سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت سے لے کر علی گڑھ کے قیام کے آخر تک انھوں نے نئی طرزِ فکر کو سمجھنے کی کوشش کی، وہیں پر پروفیسر آرنلڈ سے رابطہ پیدا ہوا۔ جس کے بارے میں انھوں نے کہا تھا "آنکہ رفیق است و ہم استاد مرا" سرسید کے وسیع کتب خانے سے فائدہ اٹھایا۔ جس کی تاریخ کا اردو میں ترجمہ دیکھا۔"[2]

ایک جگہ پھر لکھتے ہیں۔

"سرسید شبلی کی برابر ہمت افزائی کرتے، نظم پڑھواتے، پھر اپنے اخبار میں شائع کرتے، پبلک جلسوں میں ان سے ڈیولیوشنوں پر تقریر کراتے۔ انھیں کی کوششوں سے مولانا شبلی کو 1894ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اس موقع پر انھوں نے شبلی کی تعریف کی۔ اور ان کو عوام میں زیادہ روشناس کرایا۔"[3]

1۔ مقتدا احمد خاں شیروانی: شبلی کا قیام علی گڑھ میں ص 83 مقالات یومِ شبلی اردو مرکز 1961ء لاہور

2۔ " " " " " " " ص 85 " " " "

1961ء لاہور

3۔ " " " " " " " " " " " "

ڈاکٹر عبداللہ لکھتے ہیں۔

"اسی لئے 1893ء سے لے کر 1895ء تک چار سال کے عرصہ میں قابل ذکر نوجوان خالص قومی جوش کے علاوہ گہرے علمی ذوق لے کر نکلے۔ ان میں مولانا محمد علی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر عبداللہ، خواجہ غلام الثقلین، قریشی محمد ناظر اور مولانا ظفر علی خاں تھے۔ اسی کے ساتھ مولانا شوکت علی، سید تصدق علی بدایونی کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا" 1

مولانا ظفر علی خاں کے دوسرے استاد پروفیسر تھامس آرنلڈ تھے۔ جن کی نصیحتوں سے وہ بیش فائدہ حاصل کرتے تھے۔ بقول مولانا ظفر علی خاں۔

"وہ ہمیشہ اپنے شاگردوں کو ایسی قیمتی نصیحتیں فرماتے دیتے تھے جو آپ کے وسیع تجربے اور ذوق علمی کا حصہ ہیں" 2

بقول ڈاکٹر عبدالحق۔

"پروفیسر آرنلڈ کی حیثیت کالج میں خاص، بلکہ امتیازی تھی۔ وہ سچے علم دوست تھے۔ ان میں عالمانہ اور طالب علمانہ دونوں صفتیں پائی جاتی تھیں۔ میں نے انھیں کالج میں انگریزی لباس میں نہیں دیکھا۔ وہ کالج میں عربی لباس میں آتے تھے۔ سر پر عمامہ، بدن پر عبا و قبا، پیروں میں سلیم شاہی جوتا، ہاتھوں میں موٹے دستے کی چھڑی لیے۔ جلدی جلدی قدم اٹھاتے ٹھیک وقت

1۔ ڈاکٹر عبداللہ: مرتب مقالات یوم شبلی ص۔ 100

2۔ ظفر علی خاں۔ کار اپریل 1929ء زمیندار۔ لاہور

پر آجاتے"[1]

آگے لکھتے ہیں۔

"علی گڑھ کی اقامتی زندگی اور سرسید کے زیر اثر دینے اور خاص یونی فارم پہننے سے طلباء کو ایک خاص انداز میں سوچنے کا عادی بنا دیا"[2]

اس میں شک نہیں کہ علی گڑھ کی تعلیم نے ان کے مشرقی مزاج کو سنوارا، زبان میں لوچ اور چاشنی پیدا کی۔ مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے میں جو حصہ انھوں نے لیا۔ وہ علی گڑھ کالج کی دین تھی۔

مولانا ظفر علی خاں بی۔ اے۔ کا امتحان دینے کے بعد ملازمت کے لئے نواب محسن الملک کے پاس بمبئی گئے۔ جنھیں خواجہ غلام الثقلین کی علیحدگی کے بعد ایک پرائیوٹ سکریٹری کی ضرورت تھی۔ وہ ان کی خدمت میں ایک سال رہے۔ جہاں نواب محسن الملک کی فیضِ تربیت نے ان کے علمی ذوق کو سنوارا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ۔

"ان علمی مشاغل کے لئے جس کے ساتھ مجھے آج تک وابستگی ہے، میں نواب محسن الملک ہی کے فیضِ تربیت کا رہین احسان ہوں"[3]

نواب محسن الملک کے متعلق سرور الملک آغا مرزا دہلوی لکھتے ہیں۔

"اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ایسا دماغ عطا فرمایا تھا کہ اگر

1۔ ڈاکٹر عبدالحق: نقوش آپ بیتی نمبر ص 136 جون 1964ء لاہور

2۔ ایضاً

3۔ ظفر علی خاں خود نوشت سوانح عمری 1928ء لاہور

یہ یورپ میں ہوتا تو بسمارک اور ڈیزلی بھی اس کے آگے کان پکڑتے"[1]

مولانا ظفر علی خاں لکھتے ہیں۔

"پورا ایک سال اس طور پر گزرا تھا۔ کہ استاذی و ملازمی علامہ شبلی مرحوم سفر حیدرآباد سے واپسی پر بمبئی ٹھہرے اور مجھے حیدرآباد جا کر قسمت آزمائی کرنے کی صلاح دی۔ یہ عین میرے دل کا مدعا تھا۔ میں حیدرآباد چلا گیا"[2]

مولانا ظفر علی خاں حیدرآباد چلے گئے تو یہاں کے قیام نے ان کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ کیونکہ وہاں کی خاص تہذیب، منتخب احباب اور ان کی آداب مجلسی، اعلیٰ اصول اور اسلامی حکومت۔ یہ ایسی چیزیں تھیں جو کہ ان کے مزاج کو ایک نئے انداز میں ڈھالنے میں خاص مددگار ثابت ہوئیں اور ان کو علمی فائدے بھی ہوئے۔ وہ خود اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"دکن کے مسلم عوام اور سلاطین بہت پہلے سے مسلم اقتدار کی آلودگیوں کے لذت چشیدہ اور مسلم حکمرانوں کی برکتوں کے فیض رسیدہ تھے۔ ان عوامل نے ان کے اندر ایک انفرادیت کا خاص شعور پیدا کر دیا تھا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ مملکت آصفیہ کے ارباب حل و عقد نے آگے بڑھ کر مسلمانان ہند کی تہذیبی و تمدنی روایات اور فکر تحقیق کی امانت کو اپنے

1۔ سرور الملک۔ نقوش آپ بیتی نمبر ص 661 1964ء لاہور

2۔ زمیندار۔ سیفٹہ دار کرم آباد یکم جنوری 1910ء

سینے سے لگا لیا۔ اس امانت کو علو ہمتی سیر چشمی اور دل سوزی کے ساتھ دو صدیوں تک سنبھالے رکھا۔ حیدر آباد نے مسلم تاریخ کے ہر نازک لمحے اور ہر اہم موڑ پر عالم اسلام کی فلاح و بہبودگی کے ہر اقدام میں پیش قدمی کی، اور دوسرے تمام شرکاء سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا"[1]

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

"(مولانا) ظفر علی خاں یہاں 1896ء کے آخر میں (بمبئی سے) پہنچے تھے اور تیرہ (13) برس قیام رہا۔ ان کا مکان بھی مولانا شبلی کے مکان کے متصل ہی تھا۔ اور قریب ہی سید ہمایوں مرزا بیرسٹر ایٹ لاء کا مکان بھی تھا۔ اس لئے انھیں وہاں مشرقی طرز کی انجمنوں میں شریک ہونے اور دلبستگی میں نظمیں پڑھنے کے مواقع ملتے رہے"[2]

ہمایوں مرزا بیرسٹر ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"اسی زمانے میں ہم ملک (غلام قادر خاں مرحوم، شیخ ولایت حسن اور شیخ عبدالرحیم) نے ایک انجمن موسوم، افتخار دکن قائم کی۔ جس کے اغراض میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی درستی۔ مسلمان لڑکیوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنا، اداکین میں برجستہ تقریر کی عادت پیدا کرنا اور معاشرے کی اصلاح شامل تھی۔ اس کے جلسے شیخ ابراہیم فاروق (فاروق یار جنگ دکن

1۔ مولانا ظفر علی خاں: خود نوشت سوانح عمری، زمیندار اپریل 1928ء لاہور

2۔ سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی۔ ص 279

ہائی کورٹ حیدرآباد) کے مکان پر ہوتے رہے۔ فاروق صاحب کا مکان بھی علامہ شبلی کے مکان کے قریب تھا۔ شبلی بھی ان ماہانہ دعوتوں میں شریک ہوتے تھے اور ظفر علی خاں بھی" 1

مولانا ظفر علی خاں کے تعلقات مولوی عزیز مرزا سے بہت ہی اچھے تھے۔

"جب مرزا فرحت اللہ بیگ مولوی عزیز مرزا سے ملنے کے لئے دہلی سے پہنچے تھے تو وہاں ان کے پاس ڈاکٹر عبدالحق، عبدالحلیم شرر اور مولانا ظفر علی خاں موجود تھے۔ اور وہ حیدرآباد کی حالت دیکھ رہے تھے کہ کس طرح سے وہاں پر شازشیں کام کر رہی ہیں۔ اور مولوی عبدالحلیم شرر کو تلاش معاش لکھنؤ سے حیدرآباد کھینچ لائی تھی اور انھیں امید دلائی گئی تھی کہ انھیں مولوی سراج الحسن (محسن الملک کے بھانجے) ناظم تعلیمات حیدرآباد کے تحت کو معقول ملازمت دی جائے گی اور موجودہ اینگلو انڈین مسٹر مرے مددگار ناظم تعلیمات کو ترقی دے کر کسی اور شعبے میں بھیج دیا جائے گا۔ مگر مسٹر واکر (مدار المہام فنانس حیدرآباد) کی توجہات سے امید کا گھر حسب معمول خالی رہا" 2

واکر صاحب مدار المہام فنانس ہونے کے سبب تمام دفاتر پر چھائے ہوئے تھے اور اس اونچے طبقے سے تعلق رکھنے کے سبب مولانا ظفر علی خاں کی آنکھوں

1۔ ہمایوں مرزا بیرسٹر، نقوش، آپ بیتی نمبر ص 1806

2۔ ظفر علی خاں: خود نوشت سوانح عمری۔ زمیندار لاہور اپریل 1928ء

کے سامنے انگریزوں کی مکاری سامنے آتی جا رہی تھی۔ اور کوئی بھی بات ان سے چھپی نہیں تھی جیسے کہ۔

"پنجاب اور برطانوی ہند کے دوسرے علاقوں کی طرح دیسی ریاستوں میں بھی" کاسہ لیسان خوان فرنگ" کی کمی نہیں"[1]

مولانا ظفر علی خاں کی شعلہ بیانی، شوخگوئی اور انگریز دشمنی کے سبب سب کو یقین ہو گیا تھا کہ ایک نظم "واکر نامہ" مولانا ظفر علی خاں نے ہی لکھی ہے۔ بقول مولانا ظفر علی خاں۔

"سر گاڈن واکر میں الہام فیاضی کے ملوکیت مآب دل میں یہ شبہ ڈال دیا گیا تھا کہ اس نظم کا مصنف میں ہی ہوں"[2]

اس نظم کا مطلع اس طرح سے تھا۔

نہ بنگال سے گھبرا اور نہ صدا اس کی پرواہ کر
مگر سجدہ میں جھک گر پڑ اگر آئے نظر واکر

اس کے بعد وہ کہتے ہیں۔

"میری روشن طبع از بسکہ میرے لئے بلا ہو چکی تھی۔ اس لئے حیدرآباد کے انگریزی حلقوں میں "واکر نامہ" کی حقیقت کا الزام مجھ پر تھپ گیا کہ مجھ ہی میں اس قسم کے اشعار کہنے کا سلیقہ بدرجہ اتم موجود ہے"[3]

1۔ ظفر علی خاں۔ خود نوشت سوانح عمری، زمیندار اپریل 1928ء لاہور
2۔ ظفر علی خاں۔ زمیندار ہفتہ وار کرم آباد یکم جنوری 1910ء
3۔ ظفر علی خاں۔ خود نوشت سوانح عمری، زمیندار اپریل 1928ء لاہور

اس وجہ سے انگریزان سے نفرت کرنے لگے۔ وہ اس چھپی ہوئی نفرت کے سبب پنجاب میں سرکاری ملازمت کی مسلسل دعوت کو رد کرتے رہے۔ جب حیدرآباد میں اسی نیت سے واسطہ پڑا تو انھیں اس غصّہ کا اظہار 'واکرنامہ' کی شکل میں کرنا پڑا۔ اس نظم کے شائع ہونے سے حیدرآباد کی فضا ان کے لئے سازگار نہ رہی۔

حیدرآباد میں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ 'واکرنامہ' ہی ان کے نکالے جانے کا باعث ہوا۔ لیکن مولانا ظفر علی خاں نے اس کی تردید کی ہے۔ اور وہاں سے نکالے جانے کے سلسلے میں ایک دوسرا ہی واقعہ بیان کیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

"سرمائیکل اڈوائر حیدرآباد کے ریذیڈنٹ تھے۔ اس زمانے میں سینما کمپنی آئی ہوئی تھی۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بعض پرانے طالب العلموں نے اسے (کمپنی کو) اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ایک رات کے تماشے کی آمدنی علی گڑھ کے لئے وقف کر دے۔ رات کے وقت جب کھیل ہوا تو تھیٹر امراء اعیان دولت اور متوسطہ کے تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کمپنی والوں نے اخلاقی معاشرت کا ایک عجیب و غریب نظارہ دکھایا۔ کہ مرد عورتوں کے ساتھ بے حجابانہ کرنا بجا دیتے تھے۔ کھیل کے خاتمے پر مجھ سے فرمائش کی گئی کہ میں موزوں الفاظ میں کمپنی کا شکریہ ادا کروں۔ میں نے ایک تقریر کی جس میں بر محل تذکرہ مشرقی اور مغربی تہذیب کا

مقابلہ کرتے ہوئے ناجائز والی تحریک، تصویر کا حوالہ دیا۔ اور کہا کہ

"اگر ہندوستان کے مردوں اور عورتوں نے بھی ان اطالویوں کی

نقلیں شروع کر دیں تو پھر یہ مادے ایمان و ایقان کا خاتمہ ہے"[1]

مولانا ظفر علی خاں نے اس کے بعد دوسرے دن کا جو واقعہ بیان کیا۔ وہ

اس طرح ہے۔

"دوسرے دن جب میں دفتر گیا (ان ایام میں میں اسسٹنٹ ہوم

سکریٹری تھا) تو مولوی عزیز مرزا مرحوم ہوم سکریٹری نے مجھے

طلب کر کے مہاراجہ سرکشن پرشاد مدار المہام کا ایک مراسلہ

دکھایا۔ جس میں جناب عالی شان دیدبدینٹ کے ایک حکم کی

بنا پر مجھ سے واقعہ دہشت کے متعلق جواب طلب کیا گیا تھا۔

اور جناب مائیکل اڈوائر اپنے مخصوص جلالی لہجہ میں مجھ پر یہ الزام

برسے تھے کہ نظام گورنمنٹ کے ایک عہدہ دار نے کل ذات علانیہ

طور سے مغربی نسائیت پر جو بے باکانہ نکتہ چینی کی۔ اس کی

نسبت اس سے سختی سے باز پرس کی جائے"[2]

مولانا ظفر علی خاں نے اس کا جواب اسی وقت لکھ کر مولوی عزیز مرزا کو دے

دیا کہ۔

"میرا رویہ کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں تھا۔ اور مہاراجہ

سرکشن پرشاد کو بھی مزید تحقیقات کے بعد اطمینان ہو گیا۔

1۔ مولانا ظفر علی خاں۔ خود نوشت سوانح عمری ذمیندار اپریل 1928ء

2۔ ایضاً۔

لیکن اڈوائر صاحب کی تشفی اس سے کیوں کر ہو سکتی ہے"۔[1]

مولانا ظفر علی خاں کو ۹ اکتوبر 1909ء کا دن ایک اہم دن تھا۔ کیونکہ ان کو حیدرآباد سے چلے جانے کا حکم ملا تھا۔ اس وقت ان کے دل کی جو کیفیت تھی وہ انھیں کے الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں۔

"۹ اکتوبر کو ہماری قسمت نے دفعتہً پلٹا کھایا یعنی مشیت ایزدی عتاب الٰہی کی شکل میں نازل ہوئی"۔[2]

مولانا ظفر علی خاں نے ایک اداریہ میں لکھا ہے۔

"حیدرآباد دکن کو خیرباد کہتے ہوئے جو کیفیت ہمارے قلب پر طاری ہوئی۔ اس کا اندازہ اس وقت کوئی کیا کر سکتا ہے جب ناخن گوشت سے جدا ہو رہا ہو۔ تیرہ (13) سال کا بنا بنایا گھر آن کی آن میں اجڑ گیا۔ دیرینہ صحبتوں کی وہ شمع جسے ایک عمر کی ہر افروزی نے روشن کیا تھا۔ باد حوادث کے ایک جھونکے سے بجھ گئی"۔[3]

مولانا ظفر علی خاں جب گھر پہنچے تو ان کے والد مولوی سراج الدین احمد سخت بیمار تھے۔ انھوں نے مرتے وقت ان سے جو وصیت کی وہ یہ تھی کہ "اخبار زمیندار سے غافل نہ ہونا میں نے اسے اپنے خون سے سینچا ہے" اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

1۔ مولانا ظفر علی خاں: خود نوشت سوانح عمری۔ زمیندار اپریل 1928ء لاہور

2۔ ایضاً۔

3۔ اداریہ۔ زمیندار ہفتہ وار کرم آباد جنوری 1910ء

"6 دسمبر 1909ء کو صبح ہمارے لئے قیامت بن کر طلوع ہوئی تھی۔ یعنی قبلہ وکعبہ جناب مولوی سراج الدین احمد خاں صاحب کا سایہ ہمارے سر سے ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا۔ مال کا نقصان جو ہماری جیبوں سے بڑھ کر ہو چکا تھا۔ اب لے دے کر ایک جان حزیں باقی رہ گئی تھی۔ اس کے فرض پر بھی ایک بجلی گری اور وہ شخص جس کا وجود قوم کے ایک بہت بڑے طبقہ کے لئے آئینہ لطف و رحمت اور ملک کے ایک بڑے حصے کے لئے دلیل خیر و برکت ہونے کے علاوہ ہماری آزادیوں اور فارغ البالیوں کا کفیل اعظم تھا۔ مٹی میں جا ملا"[1]

اس کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے مستقبل کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے ایک اداریہ میں لکھا ہے۔

"جن خاندانی اور قومی ذمہ داریوں کا بوجھ یک بیک اس جاں فرسا سانحہ نے جس کے لئے ہم تیار نہ تھے ہمارے کندھوں پر لاڈالا ہے۔ وہ گراں وزنی ہے کہ جو اس بار امانت سے کسی طرح کم نہیں جس کی تاب ارض و سما نہ لا سکے تھے۔ خدا ہی جو ہم اس حق کو برداشت کرنے سے پوری طرح عہدہ بر آ ہو سکیں"[2]

1۔ مولانا ظفر علی خاں۔ خود نوشت سوانح عمری اپریل 1928ء ذمیندار لاہور

2۔ مولانا ظفر علی خاں۔ اداریہ ذمیندار بیضۃ دار کرم آباد جنوری 1910ء

مولانا ظفر علی خاں جس شوق سے حیدرآباد آئے تھے اتنی ہی پریشانیوں کے ساتھ وہاں سے نکالے گئے۔ لیکن حیدرآباد سے نکلتے وقت کی پریشانیاں ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا پیش خیمہ بنی۔ اس طرح سے ایک حوصلہ کے ساتھ اپنے وطن کرم آباد واپس آئے اور اپنی محنت اور صلاحیتوں سے ایک نئی دنیا آباد کرلی اور قوم کی بھلائی میں دل و جان سے لگ گئے۔

صحافتی زندگی

ایک عام نظریہ رہا ہے کہ اخبار نویسی کے فن میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے جن صلاحیتوں اور خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ اس سے عام لوگ آگاہ نہیں۔ کیونکہ صحافت کا پیشہ دل چسپ بھی ہے اور دقت طلب بھی۔ اخبار "سنڈے ٹائمز" کے ایڈیٹر مسٹر لیونارڈ ڈیس کا خیال ہے کہ۔

"اخبار نویس میں چار صفات کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی تعلیم، مشاہدہ، قوتِ امتیاز اور احساسِ ذمہ داری"[1]

تعلیم ایک بنیاد ہے۔ جس پر زینہ بہ زینہ ترقی کر کے اخبار نویس اپنے مستقبل کی تعمیر کرتا ہے۔ مشاہدہ کی قوت صحافت میں ہر قدم پر درکار ہے اور قوتِ امتیاز سے وہ ضروری اور غیر ضروری باتوں میں تمیز کرتا ہے اور احساس ذمہ داری میں محنت کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ رات دن کام کی لگن، وقت پر اخبار شائع کرنا۔ خبروں کو مناسب انداز میں ترتیب دینا۔ اپنی رائے کا تنقیدی جائزہ بھی اخبار کو کامیاب بناتا ہے۔ صحت دماغی اس کے ساتھ ایک لازمی چیز ہے۔ تاکہ انسان صحیح نتیجہ پر جلد از جلد پہنچ سکے۔ اسلئے اخبار نویس کی ایک غلطی بھی اس کے مستقبل پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

1۔ ماڈرن جرنلزم، پٹمین اینڈ سنز۔ لندن

اخبار کو رائے عامہ کا ترجمان کہا جاتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ اپنی آواز موثر طریقہ پر لوگوں تک یا حکومت تک پہنچا سکیں۔ قانون اور تہذیب کے اندر رہ کر اور حکومت اور پبلک اداروں کی نامناسب کاروائیوں پر تنقید کریں۔ اس طرح اخبار نویس کا کام رائے عامہ کو بیدار کرنا اور ان کی راہ نمائی کرنا ہے۔ اس کے لئے پریس بہت ہی اہم ہے۔ کیونکہ پریس عوام تک اپنے خیالات پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے۔ اور موجودہ دور میں جو صنعتی انقلاب آیا۔ اس کے سبب سے پریس کی اہمیت بہت ہی بڑھ گئی اور اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ قانونی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں۔ اخبار میں تمام خبروں کو اس طرح جمع کیا جائے کہ ایک درمیانی طبقہ کا آدمی اپنے گرد و پیش کی تمام معلومات کا جائزہ لے سکے۔ اور ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ اس لئے ان سب چیزوں کو ایک جگہ جمع کر کے اخبار کے ذریعہ لوگوں تک پہنچایا جاتا ہے۔

اخبار عوام تک آواز پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اخبار کی قومی و وطنی ذمہ داریاں پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ عوام کے ذہن تک رسائی حاصل کرنا اس کے اہم اثرات میں سے ہے۔ اس لئے اخبار مفید اور تعمیری ادارے کا کام دے سکتا ہے۔ کیونکہ تمام انسان دوسروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اس وجہ سے اخبار اس ذوقِ تجسس اور حصولِ معلومات کے لئے ایک خارجی ذریعہ کا کام دیتا ہے۔ وہ اپنی بہترین اور تازہ معلومات کے ذریعے عوام کی توجہ اور التفات

حاصل کرتا ہے۔ اس لئے ایک اخبار نویسی کے لئے خصوصی قابلیت کا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ اس کا نقطہ نظر اور اس کا رجحان قطعی طور سے تمام واقعات کو ایک جگہ کر کے ایک نتیجہ نکال سکے۔ اخبار نویس یا کالم نگار کو ایسی چیزیں سامنے لانا چاہئے جو ان کی مطالب کی اور زندگی بہتر بنانے کے لئے ہوں اور اس کو عوام اپنے دل کی آواز جانیں۔

ہندوستان میں اخبار نویسی اس وقت شروع ہوئی جب ایک گروہ جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مخالف تھا۔ اس گروہ نے سب سے پہلے اخبار نکالنے شروع کئے۔ یہ اخبار اٹھارویں صدی میں بڑے شہروں جیسے کلکتہ، مدراس، بمبئی، دہلی میں چھپتے تھے۔ ان اخباروں میں کمپنی کی مخالفت کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ انداز بیان کے اعتبار سے بھی انگریزی اخباروں کا چربہ ہوتے تھے۔ 1816ء میں پہلا بنگالی اخبار بنگال سے نکلا۔ اس کا نام انگریزی میں "بنگال گزٹ" تھا۔ اس طرح کلکتہ اور آگرہ سے بھی مختلف اخبار فارسی کے نکلنے رہے۔ 1835ء میں "سلطان الاخبار" کلکتہ سے نکلا۔ 1833ء میں "زبدۃ الاخبار" آگرہ سے نکلا۔

1813ء میں اردو چھاپہ خانوں کا دور شمالی ہند میں شروع ہوا اور دہلی کا پہلا اخبار "دہلی اخبار" تھا۔ جس کا اجرا 1837ء میں ہوا۔ یہ اخبار دو کالموں میں چھپتا تھا۔

"پہلے کالم کی پہلی سرخی "خصوصی" ہوا کرتی تھی۔ اس سرخی کے تحت قلعہ معلی کی خبریں چھاپی جاتی تھیں۔ اس کے بعد دوسرا

کام "صاحب کلام بہادر" ہوتا تھا۔ جس کے تحت ریذیڈنٹ بہادر اور دوسرے صاحبان ذی شان کی خبریں چھاپی جاتی تھیں"[1]

1837ء میں سید محمد خاں نے جو کہ سر سید احمد خاں کے بھائی تھے۔ انھوں نے ایک اخبار "سید الاخبار" جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی عبد الغفور قانون سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لئے ان کا اخبار وکیلوں میں بہت مقبول ہوا سید محمد خاں کا عین جوانی 1846ء میں انتقال ہوگیا۔ اس وجہ سے اخبار کی ذمہ داری سر سید احمد خاں پر آ گئی۔ ان کے لئے یہی اخبار اخبار نویسی کا پہلا مکتب تھا۔ بقول سر عبد القادر۔

"سر سید احمد خاں نے "سید الاخبار" میں مضامین لکھ کر اپنی اخبار نویسی کی مستقل بنیاد رکھی۔ "سید الاخبار" کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے۔ یہی خصوصیت کافی ہے۔ فنی حیثیت سے اخلاقی، علمی، مذہبی اور تاریخی مضامین ان ہی کی ایجاد ہیں۔ یہ اخبار 1848ء تک جاری رہا"[2]

1836ء سے بعد چند سال کے اندر اندر بہت سے رسالے اور اخبارات شائع ہونے لگے۔ ان میں "فوائد الناظرین" "قرآن السعدین" "السعد الاخبار" ایسے اخبار تھے جو پہلے اردو اخبار کی اشاعت کے انداز میں شائع ہوتے۔ اور اتنے مشہور ہوئے کہ ان کا ذکر کتابوں، رسالوں اور مقالوں میں محفوظ ہے۔ انھیں اخباروں میں ایک

---

1. رسالہ "زمانہ" کانپور۔ اکتوبر 1906ء بحوالہ تاریخ صحافت جلد سوم ص 125
2. محمد عتیق صدیقی۔ ہندوستانی اخبار نویسی ص 267

نہایت ہی اہم اخبار "کوہ نور" تھا جو 1850ء سے 1904ء تک جاری رہا۔ یہ اخبار پنجاب سے شائع ہوا تھا۔ اور اس کو نئے انداز کا پہلا اخبار کہا گیا۔ اس اخبار کو منشی ہرسکھ رائے نے جو سکندرآباد کے رہنے والے تھے۔ لاہور سے جاری کیا۔ اور یہ اتنا مشہور ہوا کہ اس کے خریدار ہر بڑے شہر میں تھے۔ 1883ء میں ہفتہ وار سے روزانہ ہو گیا۔

1857ء کے غدر کے بعد صحافت کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جب حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر براہِ راست تاجِ برطانیہ کی نگرانی میں آ گئی تو اخبار ملکی مسائل پر رائے زنی کرنے لگے۔ اس دور کا سب سے پہلا اردو کا اخبار 1858ء کے آغاز میں "اودھ اخبار" جو کہ منشی نول کشور نے لکھنؤ سے جاری کیا تھا۔ جو 1876ء میں روزنامہ بن گیا۔ یہ اخبار اردو کے چند اہم اور بڑے اخباروں میں شمار ہوتا تھا۔ بقول سرسید احمد خاں۔

"اودھ اخبار پہلے ہی نہایت باوقعت اخبار تھا اور اب تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ ہم کو یہ بھی امید ہے کہ ہمارے اور ہم عصر "اودھ اخبار" کی تقلید کریں گے۔ اور منشی نول کشور اعلیٰ ہمتی سے قوی امید ہے کہ ان کا یہ اخبار مثل تاوقت انگریزی اخبار کے روزانہ جاری ہوا کرے گا"[1]

'کوہ نور' اور 'اودھ اخبار' کے جاری ہونے کا زمانہ اردو اخبار نویسی کا انیسویں صدی میں دوسرا دور تھا۔ اسی زمانے میں لاہور سے ایک اور اخبار نکلا۔

---

1. سرسید احمد خاں۔ 'تہذیب الاخلاق' علی گڈھ۔ یکم جمادی الثانی 1288ء

جس کے مالک پنڈت بال مکند تھے۔ یہ اخبار "اخبارِ عام" کے نام سے جاری ہوا۔
یہ اخبار صرف خبروں کا ہی اخبار تھا۔

سرسید نے 9 جنوری 1866ء کو ایک جلسہ جس کا نام "سائنٹفک سوسائٹی" تھا غازی پور میں قائم کی۔ جب اس سال سرسید احمد خاں کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا۔ تو وہ اس سوسائٹی کا دفتر علی گڑھ لے آئے۔ اور 1866ء میں علی گڑھ سے "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" یا علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" جاری کیا۔ پہلے یہ اخبار ہفتہ وار نکلا۔ پھر بعد کو سہ روزہ ہوگیا۔ سرسید احمد خاں نے ایک مرتبہ گورنمنٹ اور ہندوستانی اخبارات کے نام سے ایک اداریے میں جہاں اردو اخبارات کو تلقین کی کہ وہ حدِ اعتدال سے متجاوز نہ ہوں" وہاں حکومت سے بھی یہ کہا کہ جو مضرتیں صحافت کی آزادی سے پیدا ہوتی ہیں وہ پابندی لگانے سے اور بھی بڑھ جائیں گی۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ۔

"سرسید کی صحافت میں دو باتیں بڑی چمک اور تابانی دکھتی ہیں۔ اول ان کی صحافت کی دیدہ زیبی، ٹائپ کا حسن اور کاغذ کی عمدگی۔ اس لحاظ سے ان کے اخبار موجودہ ترقی یافتہ یورپ کے اعلیٰ اخبارات اور رسائل سے کسی طرح کم نہیں۔ دوئم ان اخبارات کی مقبولیت۔ اخبارات میں واقعات اور معاملات پر بے لاگ رائے جس میں بڑی ثاقبت بینی، وسعتِ معلومات اور تعمیری نقطہ نظر جھلکتا ہے۔ یہ عقلی اور تجزیاتی اصولِ صحافت سرسید کی اخبار نویسی کے خاتمہ کے بعد سے آج تک اور وہ اخبار

نویسی میں پیدا نہ ہو سکا"[1]

سرسید احمد خاں عوام کے خیالات کی ترجمانی اس طرح سے کرتے تھے کہ انگریزی حکومت کو بے جا غلط فہمی کا موقع نہ مل سکے۔ اس لئے یہ اخبار 1866ء سے لے کر 1889ء تک برابر نکلتا رہا۔ 1869ء میں پنجاب سے ایک اور رسالہ نکلا جس کا نام "رسالہ انجمن اشاعتِ مطالب مفیدہ پنجاب" رکھا گیا۔ کچھ عرصے اس رسالے کی ادارت محمد حسین آزاد بھی کرتے رہے۔ 1870ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد "اخبار انجمن پنجاب" وجود میں آیا۔

"اخبار انجمن پنجاب نے اردو صحافت کے مسائل پر بھی کچھ مضمون چھاپے ہیں۔ اس کی اہمیت جدید نظم نگاری کے سبب سے اور بھی بڑھ جاتی ہے"[2]

1873ء میں ایک اخبار "مرقعِ تہذیب" کے نام سے منشی گوکل پرشاد دتا نے لکھنؤ سے جاری کیا۔ اس اخبار میں انجمن کی روداد کے علاوہ اصلاحی، تعلیمی، تاریخی مضامین چھپتے تھے۔ 1874ء میں "ریاض الاخبار" ستناپور سے شائع ہوا۔ اس کے بعد 1881ء سے گورکھپور سے نکلنا شروع ہوا۔ اس اخبار کے مالک ریاض خیرآبادی تھے۔ 1907ء میں یہ اخبار لکھنؤ سے نکلنے لگا۔ 1885ء میں "اودھ پنچ" کے نام سے ایک اخبار منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے جاری کیا۔ وہ اودھ پنچ کو اپنی زندگی سے زیادہ سمجھتے تھے لیکن 1904ء میں فالج کے دورے نے ان کی صحت و تندرستی کو خراب کر دیا۔

1۔ تاریخ صحافت اردو۔ جلد دوئم حصہ اول، دہلی ص 249 - 250 امداد صابری

2۔ اختر شہنشاہی۔ ص۔ 12

اور بولنے کی طاقت قریب قریب ختم ہو گئی تھی۔ لیکن چلنا پھرنا جاری تھا۔ اور دماغ بھی کام کرتا تھا۔ اس لئے انھوں نے بال مکند گپتا کو لکھا تھا کہ۔

"اودھ پنچ مردہ ہاتھوں سے اس لئے نکلتا ہے کہ کوئی اٹھانے والا نہیں۔ دو ہی سطروں کے سوا نہ ہاتھ سے لکھ سکتا ہوں نہ منھ سے لکھوا سکتا ہوں۔ کچھ نوکر ہمت کر کے نکال لیتے ہیں۔ دس سال سے فالج میں گرفتار لب گور ہوں۔ جب کسی طرف سے اطمینان نہیں تو کیا انتظام ہو سکے۔ اخبار اس لئے نکالتا ہوں کہ جیتے جی نہیں مر سکتا ورنہ اس عارضہ کے ہاتھوں وہ مجھے کیا برا تھا۔ مرنا اگر ایک بار ہوتا" اودھ پنچ" زندہ اخباروں میں نہیں کہ اس کا ذکر ہو۔ ہاں گذشتہ زمانے میں کچھ تھا"[1]

1912ء میں منشی صاحب کے انتقال سے دو سال قبل یہ اخبار بند ہو گیا۔

1883ء میں "ہندوستانی" ہفتہ وار لکھنؤ سے نکلا۔ اس اخبار میں یہ بتایا گیا کہ اردو اخبار کس راستہ پر چلیں اور کیا لکھیں۔ یہ اخبار شروع میں اردو اور ہندی دونوں میں نکلتا تھا۔ اب کو اردو میں نکلنے لگا۔ 1890ء میں ایک اخبار لکھنؤ سے "مہذب" کے نام سے مولوی عبدالحلیم شرر نے جاری کیا۔ یہ اخبار ہفتہ روزہ نکلتا تھا۔ شرر کی ادبی زندگی کا آغاز بھی صحافت کے ذریعے ہوا تھا۔ اسی زمانے میں منشی نول کشور نے انھیں "اودھ اخبار" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں لے لیا تھا۔

1۔ منشی سجاد حسین۔ خط بنام بال مکند گپتا۔ رسالہ "زمانہ" کانپور اکتوبر 1906ء بحوالہ تاریخ صحافت جلد سوم ص۔ 125

1884ء میں علی چشتی نے لاہور سے "رفیق ہند" نامی اخبار جاری کیا۔ اس نے اہلِ ہند کے جائز مطالبات منوانے اور ان کے حقوق کے لئے نہایت ہی جرات مندانہ انداز میں جدوجہد کی۔ اور اس طرح نہ صرف صحافت کا معیار بلند کیا بلکہ آئندہ دور کے صحافیوں کے لئے بھی ایک واضح لائحہ عمل پیش کیا۔

1887ء میں "پیسہ اخبار" محبوب عالم نے لاہور سے نکالا یہ اردو کا مقبولِ عام اخبار تھا۔ محبوب عالم نے اردو صحافت اور اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمت انجام دی۔ کیونکہ انہیں اخبار نویسی کا بڑا تجربہ تھا۔ اس وجہ سے اردو صحافت کی ترقی میں "پیسہ اخبار" ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔

1895ء میں "وکیل" امرتسر سے شیخ غلام محمد نے نکالا یہ ایک اخبار 12 (بارہ) صفحات پر نکلتا تھا۔ اس اخبار کے سلسلہ میں مولانا محمد علی لکھتے ہیں۔

"وکیل" اردو صحافت کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کے خیالات ہمیشہ دانشمندانہ اور پروقار دیے ہیں۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ ذہنی رواداری کا مظہر تھا۔ اور یہ وہ خوبی ہے جو اس دور کی بہتر انگریزی اخباروں میں بھی شاید ہی ملتی ہے"[1]

ایک جگہ "وکیل" میں لکھا ہے۔

"اس اخبار سے بڑی بڑی شخصیتیں وابستہ رہی ہیں۔ مثلاً

1۔ امداد صابری: تاریخ صحافت، جلد سوئم ص 685

مولانا عبداللہ عمادی، مولانا ابوالکلام آزاد اور آخری دور میں
مولانا عبداللہ عباس غالب دہلوی، مولوی انشاءاللہ اور مولوی
فیروزالدین فیروز وغیرہ" 1

اردو صحافت کا ایک بڑا مقصد اخبار کے علاوہ یہ بھی تھا کہ مغربی سائنس اور مشرقی علوم پر مشتمل مواد سے متعلقہ علمی مضامین شائع کیے جائیں۔ اس لیے اخبارات اس ذمہ داری کو انجام نہیں دے سکتے تھے۔ یہ کام رسائل نے انجام دیا۔ اردو زبان میں ایک منظم تحریک کی صورت میں 1836ء میں مرزا پور سے "فیض عام پریس" کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا۔ اس رسالہ میں ہر طرح کے مضامین چھپتے تھے۔ 1845ء میں "محب ہند" کے نام سے رام چندر نے ایک ماہوار علمی اور ادبی رسالہ نکالا۔ یہ اعلیٰ معیار کا علمی، معلوماتی اور تاریخی مضامین کا حامل رسالہ تھا۔ چونکہ رام چندر دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ دہلی کالج اور اس کی علمی اور صحافتی خدمات کے بارے میں ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس انجمن نے سنسکرت، عربی اور فارسی کی اعلیٰ درجے کی تصانیف نیز انگریزی کی مختلف کتابوں کے عمدہ ترجمے کر کے اہل ہند کی بڑی خدمت کی۔ 1863ء میں ایک "دہلی سوسائٹی" جو کہ علمی و ادبی سوسائٹی قائم ہوئی۔ یہ انجمن مسٹر پیارے لال آشوب کی منت کی بہت ممنون ہے۔ اس رسالہ کا پہلا شمارہ 1866ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد 1872ء کی میٹنگ میں سوسائٹی نے یہ طے کیا کہ رسالہ بہت ہی پابندی کے ساتھ نکالا جائے۔

1۔ "وکیل" امرتسر

1870ء میں رسالہ "تہذیب الاخلاق" سرسید احمد خاں نے نکالا یہ رسالہ بقول مولانا حالی۔

"مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور ان کی ترقی کی طرف مائل کرنے کے لئے سرسید نے ولایت سے آکر جاری کیا اس کی پیشانی پر جو اس کا نام اور بیل بوٹے تھی اس کا ٹائپ وہ لندن سے بنوا کر اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ پرچہ قوم کی فلاح و بہبودگی کے لئے جاری ہوا تھا"[1]

اس رسالے کا نکالنے کا مقصد سرسید احمد خاں کے الفاظ میں۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سوسیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے۔ جس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق و معاملات اور تمدن و معاشرت، اور طریقہ و تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا۔"[2]

اس رسالے کے مضمون لکھنے والوں میں سرسید احمد خاں، مولوی مہدی علی خاں، منشی مشتاق حسین، مولانا الطاف حسین حالی، منشی ذکاء اللہ اور محمد احسان اللہ وغیرہ تھے۔ سرسید مذہبی مضامین کے علاوہ معاشرتی، تمدنی مضامین بھی لکھتے تھے۔

1۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ حیاتِ جاوید۔ ص 146۔

2۔ سرسید احمد خاں۔ تہذیب الاخلاق۔ علی گڑھ جلد 1 شمارہ 1 (افتتاحیہ) 2 دسمبر 1870ء

بقول نصیر الدین ہاشمی۔

"اس رسالے کے دو تین ہی پرچے جاری ہوئے تھے کہ اس کی مخالفت چاروں طرف سے شروع ہو گئی اور کئی اخباروں اور رسالوں نے اس کی مخالفت میں بہت کچھ لکھا۔ جنھوں نے لکھا ان میں اودھ پنچ، نور الآفاق، نور الانوار اور آخر میں لاہور کا اخبار رفیق ہند اور آگرہ کا تریعدی صدی تھے۔ اخبارات کا یہ زور تیس (30) برس رہا۔ اور تہذیب الاخلاق کے اجرا سے سب سے زبردست فائدہ یہ ہو گیا کہ موافق اور مخالف طور پر اخبار بینی کا شوق بڑھ گیا۔ اور اردو زبان کی بے حد ترقی ہوئی۔ سرسید کی ہاں ہمیشہ اعتدال رہا۔ اور انھوں نے ہمیشہ ذاتیات سے گریز کیا۔ اور اس زمانے کے اخبارات نے تہذیب الاخلاق کے مضمون و بیان کے بلند معیار ہونے کی وجہ سے اس کی تعریف کی" 1

اس کے بعد طاہر فاروقی کہتے ہیں۔

"آپ کے قومی و ملکی اصلاحی کام کا پہلا آلہ کار یہی رسالہ "تہذیب الاخلاق" تھا۔ جس میں نصف کے قریب مضامین خود سرسید کے ہوتے تھے" 2

1873ء میں "مخزن الفوائد" کے نام سے ایک رسالہ نکلا۔ جس کے مدیر مولوی سید حسین بلگرامی تھے۔ یہ مغربی علوم سے لوگوں کو باخبر رکھتا تھا۔

1۔ نصیر الدین ہاشمی: مقالہ دو رسالہ "ہمایوں" ص 75 1952ء لاہور

2۔ طاہر فاروقی۔ اردو نثر کے نمونے۔

اس لئے اردو زبان کے علمی اور ادبی رسائل میں "مخزن الفوائد" اولین رسائل میں سے تھا۔ جو کہ حیدرآباد سے جاری ہوا۔ 1880ء میں رسالہ "حسن" جس کو مولوی حسن ابن عبداللہ نواب عماد نواز جنگ نے حیدرآباد سے نکالا۔ اس رسالہ کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں کہ۔

"اس میں شک نہیں ہے کہ تہذیب الاخلاق کے بعد علمی رسالے کی حیثیت سے ایک ہی رسالہ تھا جو اس کے جانشین ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ بلکہ اسے کئی لحاظ سے بعض ایسے نامور اہل قلم ہیں جن کے علم و فضل پر قوم و ملک کو ناز ہے مثلاً فاضل اجل نواب عماد الملک سید حسن بلگرامی، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن حیدرآباد شمس العلما سید علی بلگرامی۔ بی۔اے جن کے بے بہا مضامین درج ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کے زور قلم سے خود "تہذیب الاخلاق" بھی محروم رہا۔ اس رسالے میں ہر علم و فن کے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ مذہبی، تاریخی، سوشل، ملکی، محققانہ ہر قسم کے مضامین چھاپے جاتے تھے"[1]

انیسویں صدی میں چند اور اہم رسائل نکلے جو کہ اردو زبان کی ترقی کے لئے بہت ہی اچھے ثابت ہوئے۔ حیدرآباد سے کچھ اہم رسالے "دکن ریویو" سے پہلے نکلے۔ 1894ء میں حیدرآباد سے کرنڈران چیف سر افسر الملک

1۔ مولوی عبدالحق۔ مقدمہ مختارات حسن (رسالہ "حسن" کے منتخب مضامین کا مجموعہ)

کی سرپرستی میں "اختر" مولوی محب حسین نے نکالا۔ اور دو سال کے بعد مولوی عبدالحق نے اس کی ادارت اپنے ذمہ لے لی۔ 1897ء میں مہاراجہ سرکشن پرشاد نے حیدرآباد سے "دبدبہ آصفی" نکالا۔ اس وقت پنڈت دتن ناتھ سرشار روزی کی تلاش میں حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ ان کو مہاراجہ نے اس رسالے کا مدیر بنا دیا۔ یہ رسالہ بہت ہی ترقی کرتا رہا۔ لیکن سرشار کے انتقال کے بعد بند ہو گیا۔

1898ء میں مولوی محب حسین نے "معلم نسواں" نکالا جس میں عورتوں کی ترقی۔ ان کے حقوق۔ ان کی آزادی اور پردہ کی مخالفت پر مضامین ہوتے تھے۔

1898ء میں وحیدالدین سلیم کا رسالہ "معارف" نکلا۔

1899ء میں اٹاوہ سے "البشیر" نکلا۔ اور فیروزآباد ضلع آگرہ سے ایک اور مشہور رسالہ "ادیب" نئے طرز کا علمی میگزین پچاس (50) صفحات کا نکلنا شروع ہوا۔ بقول مولانا شبلی۔

"وہ اردو رسائل کا باوا آدم تھا"[1]

1899ء میں حیدرآباد سے ایک اور اخبار "جلوہ محبوب دکن" نکلا۔ بقول دامن حسن قادری۔

"اس میں مولانا ظفر علی خاں کا مقدمہ "اشرف المخلوقات" شائع ہوا۔ ان کے علاوہ "مرقع عالم" پردھوتی سے "صدق"

1۔ بحوالہ امداد صابری۔ تاریخ صحافت، جلد سوم ص 292

حیدرآباد سے "معارف" علی گڑھ سے "ادیب" آگرہ سے۔
اپنی علمی اور ادبی خدمات میں نہایت وقیع اور ممتاز تھے" 1
انیسویں صدی اردو رسالوں کا علمی معیار قائم رکھتے ہوئے ختم ہوئی۔
اور بیسویں صدی کا آغاز ہوا۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔
"اردوئے معلی" کے نام سے حسرت موہانی نے علیگڑھ سے ایک ماہنامہ
جاری کیا۔ اس کی اہمیت اس لئے بڑھ گئی تھی کہ اس کے اندر علم و
ادب کے ساتھ سیاسی مضامین بھی چھپتے تھے۔ اس وقت مولانا حسرت
موہانی صرف اکیلے مسلمان تھے جو کہ گوکھلے، تلک اور بپن چندر پال
کی سیاست کے حامی تھے۔ "اردوئے معلی" سیاست کا علم بردار
تھا" 2

جولائی 1902ء سے "افسانہ" کے نام سے مولانا ظفر علی خاں نے
ایک انگریزی ناول کے ترجمہ کا ماہوار سلسلہ شروع کیا۔ جو کہ حیدرآباد
دکن سے انگریزی کی پہلی تاریخ کو پچاس (50) صفحات کے حجم کے ساتھ مطبع
حیدرآباد پریس سے نکلنا شروع ہوا۔ یہ رسالہ سلیس اور فصیح اردو زبان
میں دلچسپ، اخلاقی اور نتیجہ خیز تھا۔ "افسانہ" کے مجرد میں مولانا نے
اس اجرا کی دلچسپ روداد بیان کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔
"'افسانہ' کی ابتدا اس طرح سے ہوئی کہ یاران باصفا نے
ماکر یہ تجویز کیا کہ اس طرح کا پرچہ نکالا جائے کہ جس میں سب

1۔ احمد حسن قادری: داستان تاریخ اردو ص۔ 792
2۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: "صحافت پاک و ہند" ص 342

کا سرمایہ اور محنت مشترکہ ہوں اور چونکہ میری نسبت میرے
رفقاء اور شرکاء کو حسن ظن تھا۔ اس لئے اس کی ایڈیٹری میرے
سپرد کی گئی تھی۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ ایک کے
سوا باقی سب رفیق اس سے الگ ہو گئے۔ تھوڑے دنوں کے
بعد وقت اور حالات نے اس دیرینہ رفیق کو بھی مجھ سے
الگ کر دیا۔ اور میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
جو کام چار آدمیوں کے سپرد تھا۔ وہ ایک آدمی کو کرنا پڑتا تھا۔
جو مالی ذمہ داری پہلے چار آدمیوں پر بٹی ہوئی تھی اب ایک سے
متعلق ہو گئی۔ دولت آصفیہ کے محکمہ ہوم سیکریٹری کی صدر مسٹر جمی
کی اہم خدمات کی انجام دہی کے بعد اس میں پورے چھ (۶) گھنٹے صرف
ہوتے ہیں۔ اور کچھ دنوں سے تو بعض عہدہ داروں کے رخصت پر
چلے جانے کی باعث جو خدمات مجھے ہوئیں۔ ان کے لحاظ سے
پورے نو (۹) گھنٹے سرکاری کام کرنا پڑتا ہے۔ میرے غریب دماغ
کی پراگندگی اور انتشار کی جو کیفیت ہوتی ہوگی اس کا اندازہ
آپ ماہ صفر میں وہ رسالہ بخوبی کر سکیں گے۔ جو سرکاری
ملازم ہیں۔ لیکن بہ ایں ہمہ کچہری سے واپس آکر تھکے دماغ کو
آرام دینے کے بجائے "افسانہ" کے لئے ترجمہ شروع کر دیتا ہوں
اس کے بعد مطبع سے آئی ہوئی کاپیاں دیکھتا ہوں۔ پروفوں کی تصحیح
کرتا ہوں۔ دفتر کی ڈاک پورا کرتا ہوں اور دوسرے مشاغل

ہیں وہ اسی پر مستزاد ہیں"[1]

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی ناولوں کے تراجم اور انگریزی رسالوں کے نمونے پر علمی، ادبی یا مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں رسائل نکل رہے تھے۔ اس کے لئے رسالہ "افسانہ" اور "دکن ریویو" جو کہ ظفر علی خاں نکال رہے تھے۔ اس کو مثال کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ 1904ء میں "افسانہ" کو "دکن ریویو" میں شامل کر لیا اور اس کو ایک حصہ بنا دیا اور افسانہ لندن اور دیگر علمی اور ادبی مضامین شامل کرنے کے بعد اب یہ ساٹھ (60) صفحات کا ہو گیا۔ اس طرح دکن ریویو میں نظم و نثر کے اعلیٰ درجے کے علمی و ادبی مضامین شائع ہونے لگے۔ اس رسالے میں صرف ایسے افسانوں کے تراجم شائع کئے جانے کا اعلان ہوا جو دلچسپ اور پر لطف ہونے کے ساتھ ساتھ ہنر آموز اور نتیجہ خیز ہوں۔ اس لئے اس نئے رسالے کی سرپرستی بہادر سر کشن پرشاد نے قبول کر لی۔

فروری 1904ء سے دکن ریویو میں جو مضامین شائع ہوئے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

مضمون	مضمون نگار
اداریہ (العالم متفرق)	ایڈیٹر
بوعلی سینا	ظفر علی
شہاب ثاقب	سید محفوظ علی
حمدوہ الدلال	ایڈیٹر
ترکِ جہانگیری و جہانگیر	شبلی

1۔ "افسانہ" حیدرآباد دکن، جلد اول، شمارہ 6 دسمبر 1902ء

سچائی کی رباعیات اور سرمد کی رباعی	ادارہ

فروری 1904ء (پہلے صفحہ پر مہاراجہ سرکشن پرشاد کی تصویر اور انعامی مضمون کا اعلان)۔

بوعلی سینا (۲)	حکیم محمد اجمل خاں (شیخ کے "قانون" پر تبصرہ)
فلسفۂ عشق	ایڈیٹر (فلسفیانہ اہم مضمون)
رقعاتِ شاد	ایڈیٹر (دلیو لو)
دیوان حمید	ایڈیٹر (دلیو لو)
تزکِ جہانگیری و جہانگیر	شبلی
تہذیب الاخلاق	شجاعت علی بیگ

مارچ 1904ء، جلد دوم نمبر ۲۔ (صفحہ اوّل پر نواب ظفر جنگ وزیر افواج دولتِ آصفیہ کی تصویر)

بوعلی سینا (۳)	ایڈیٹر
حالات نواب شمس الملک	ایڈیٹر
صنعت و حرفت کی تعلیم	مولوی عزیز مرزا اول تعلقہ اربیر
پروانہ و شمع (نظم)	نادر کاکوروی
رخصت اے بزمِ جہاں	اقبال
تزکِ جہانگیری و جہانگیر	شبلی
تقلید کا اثر عوام کی نشو و نما پر	سید محفوظ

فسانہ لندن (از صفحہ 56 تا 60) — ایڈیٹر

اپریل 1904ء جلد دوئم۔

قیامتِ خدا — ایڈیٹر

لنگر — مولوی سید محفوظ علی

عرم اور اسراف — نواب امیت جاگیردار

سلام — انیس

تخصیص — مولوی نور الصباح الدین

مئی 1904ء نمبر 5 (صفحہ اول پر نواب شہاب جنگ وزیر کوتوالی و تعمیرات کی تصویر)۔

بوعلی سینا (۲) — ایڈیٹر

اردوئے معلّٰی کی اصلاح — نقّاد

بیکن کے لطائف — —

فلسفہ عشق — ایڈیٹر

چشمِ عاشق — ایڈیٹر

قصورِ نظام — افضل حسین

احیاء علومِ عربیہ — شبلی نعمانی

دل — ایڈیٹر

جون، جولائی 1904ء نمبر 6، 7 (صفحہ اول پر صفدر جنگ وزیر عدالت و آمد و رفت کی حالات اور تصویر درج ہے)

دولت کیا ہے	مہاراجہ سرکشن پرشاد
بوعلی سینا (۵)	ایڈیٹر
توالد ن	مرزا سلطان احمد منٹگمری
نظم	شبلی
اصلاح تمدن	ذوالفقار جنگ بیرسٹر
نظم	پروفیسر تمیدالدین کراچی
دلویو (رباعیات خاں گنجینہ مثال انتخاب بہاد دانش جاز صالح)	ایڈیٹر
جزیرۂ صنہ کائی	محمد معشوق حسن بی۔ اے۔
غزل	غلام یاسین آہ دہلوی
فارسی نظم	از شبلی
غنی کی رباعی	—

اگست 1906ء (ظفر علی خاں مدیر۔ محفوظ علی ایڈیٹر

بوعلی سینا	ایڈیٹر
کلام حالی	الطاف حسین حالی
توحید	ضامن کنتوری
چاند کی ابتدائی حالت	داغت حسین بی۔ اے۔
مادہ کامل	بے نظیر شاہ
تقلید کا اثر عوام کی نشو و نما پر	محفوظ علی

غزل	پروفیسر محمد اقبال
عذرِ گناہ بدتر از گناہ	پروفیسر نقاد
دیوبند (بر نخلِ تمنا)	پروفیسر نقاد
فسانۂ لندن (جلد دوم)	ظفر علی

ماہ ستمبر 1906ء نمبر 9 -

میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟	ڈاکٹر عزیز احمد۔ ڈاکٹر آف فلاسفی، برلن یونی ورسٹی
نظم	ظفر علی
فسانۂ لندن (جلد دوم صفحہ 129 تا 202)	ظفر علی

اکتوبر 1906ء نمبر 10 -

آبروئے بادار	مولوی عزیز مرزا
کلامِ اکبر	اکبر الہ آبادی
مبادی علوم	مرزا سلطان احمد
نظم فارسی	نورالدین حاجی ہائی کورٹ
دیوبند (بر شتب؟)	-
فسانۂ لندن (صفحہ 203 تا 226)	ظفر علی

نومبر و دسمبر 1906ء نمبر 11، 12 (صفحہ اوّل پر کرنل افسر ڈیگ بہادر سپہ سالار افواج آصفیہ کی تصویر) -

بوعلی سینا (۷)	ایڈیٹر

غزل	شاد
ترقی ایران ممکن است	مرزا اسماعیل
غزل	اشرف حسین شمسی
زبان	مرزا سلطان احمد
دکرم عروسی	عزیز مرزا
غزل	نور الضیا الدین
افریقہ کا مسافر	محفوظ علی
غزل حالی	الطاف حسین حالی
موج دریا	اقبال
فزاد دسیدہ پھول	درگا پرشاد
سلطان محمود غزنوی	م۔ع۔ دکن
قصیدہ	ایڈیٹر
حالات کرنل افسر الملک	ایڈیٹر (صفحہ 71)
دیویو (بر کتب و رسائل)	ایڈیٹر (از صفحہ 71 تا 82)
فسانہ لندن	ایڈیٹر (از صفحہ 227 تا 250)

جب 1906ء ختم ہوگیا تو ایڈیٹر کی طرف سے ضروری التماس میں یہ اعلان ہوا کہ دکن ریویو کا پہلا سال بخیر خوبی ختم ہوا۔ آئندہ سال سے افسانہ کا لفظ حذف کر دیا جائے گا۔ صرف "دکن ریویو" کا نام باقی رہے گا۔

"دکن ریویو" کے ساتھ ہی ایک کا نام "اسلام جنگ" ہو

ستمبر، اکتوبر ۱۹۰۵ء کے شمارہ پر مشتمل ہے اور دوسرا نمبر "ہندو نمبر" تھا۔ اس طویل فہرست مضامین سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ 'دکن ریویو' نے اپنے علمی اور ادبی لحاظ سے ملک کے اچھے اور نامور انشاء پردازوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا تھا۔

مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے 'دکن ریویو' میں جو اہم اداریے لکھے گئے ان میں سے کچھ کے اہم اقتباسات درج ذیل ہیں تاکہ ان کے طرزِ تحریر اور اندازِ بیان کا اندازہ ہو سکے گا۔

از جنوری ۱۹۰۶ء

سال نو اور ہم

آج سن لیں گے ہم ایک ترانہ نیا اک حکایت نئی اک فسانہ نیا۔

علم منطق میں ہر مبتدی کا پہلا سبق یہ ہوتا ہے۔ "العالم متغیر" بظاہر یہ دو الفاظ کا چھوٹا سا جملہ ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کا دائرہ اطلاق اس قدر وسیع ہے کہ نظامِ شمسی کے بڑے سے بڑے جرم سے لے کر چھوٹے ذرّے تک ہر ایک نے اس قانون کی پابندی ہے۔ جو اس جملے کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔ بعض بزرگوں اور سرم فرماؤں نے جن میں اکثر ایسے ہیں۔ جن کی رائے کی ہماری نظروں میں بہت بڑی وقعت ہے۔ بلحاظ اس حسنِ ظن کے جو انھیں ہماری نسبت ہے۔ ہم سے کہا ہے کہ "افسانہ" نگاری سے ہم اپنے زورِ قلم اور قوتِ دماغ کو بے جا صرف کر دیتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اگر کوئی اعلیٰ درجہ کا علمی رسالہ جس میں اخلاق،

فلسفہ اور علم جدید کے نکات مندرج ہوں۔ شائع کیا جائے تو ملک وقوم کو بہت زیادہ فائدہ ہو۔ اگرچہ ہم اس بات سے اختلاف کرنا گناہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی بعض ایسے وجوہ ہیں جن کی بنا پر "افسانہ" کا اجرا نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا تو غیر حق بجانب بھی نہیں کہا جا سکتا۔

اولاً ملک میں جس قدر پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کا دماغ ثقیل علمی مضامین کے بار کا متحمل نہیں ہو سکتا اور ملک میں علم، مذاق ابھی اس درجہ عام نہیں ہوا کہ ایسے رسالے جن میں علمی مضامین درج ہوں۔ دار بہ قبولیت حاصل کر سکے۔ ہمارے یہاں کی تعلیم یافتہ پبلک چاہتی ہے کہ اس کے سامنے زیادہ تر ایسی تصنیفات و تالیفات پیش کی جائیں۔ جن میں غور و فکر کا کام اپنی اور ان کی جانب سے مولف یا مصنف انجام دے چکا ہو۔ اور ان کے لئے فقط پڑھنا باقی رہ جائے۔ غالباً ناول و افسانے فی نفسہ ایسے قابلِ مذمت نہیں ہوتے۔ بلکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو تہذیب نفس اور علمِ اخلاق کا سب سے دل پسند اور سب سے مرغوب ذریعہ ہیں۔

طبیب جب دیکھتا ہے کہ مریض کڑوی دوا سے جی چراتا ہے تو اسے تلخ گولی میں لپیٹ کر کھلاتا ہے۔ عام طبائع میں اخلاق کے الوانے اور بے مزہ سے سالن کو پسند نہیں کرتے تاوقتیکہ بذلہ سنجی اور ظرافت کا چٹخارہ اس میں نہ دیا جائے۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر ہم نے افسانے کا جاری کرنا مناسب سمجھا۔ اس کا اندازہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ آیا ان

۶۰۰ صفحوں میں جو اس وقت تک افسانہ ان کی خدمت میں پیش کر چکا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اپنے ناظرین کی تفریح اور دل بستگی کے لئے صرف ایسے مضامین پیش کرنے سے جو ان کی خواہش قصہ بینی ہی کو پورا کرتے ہوں۔ اور ناظرین کی دماغی خواہش کے پورا کرنے کا سامان بھی بہم پہنچائیں۔ گو عام طور پر وہ خواہشیں کیسی ہی سخیف کیوں نہ ہوں۔

اس کے علاوہ خود ناظرین کی طبیعت بھی ایک سال تک ایک قصہ پڑھتے پڑھتے اکتا گئی ہوگی۔ اس لئے ہم انکسار سے کام لیتے ہیں۔ اور افسانے کے حجم میں کسی قدر اضافہ کر کے اس کی دو حصے کئے دیتے ہیں۔ حصہ اول میں جس کا نام "دکن ڈیلوئیو" ہے کیا گیا۔ نظر و نثر کے مختلف مضامین اور دل چسپ باتیں ہوا کریں گی۔ دوسرے حصہ میں جو افسانہ کا حصہ اصل ہے۔ بدستور قصہ ہی شائع ہوا کرے گا۔ حجم کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ 32 صفحے فسانہ لندن کے اور 24 صفحے دکن ڈیلوئیو کے لئے۔

2۔ دولت ابد مدت آصفیہ کے جلیل القدر امراء اور اراکین کے علاوہ قوم کے واجب التعظیم راہ نما نواب حسن الملک بہادر، ڈپٹی برکت علی، شمس العلماء شبلی، شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی، خان بہادر میر اکبر حسین، نواب اعتماد جنگ ممبر کونسل ریاست ٹونک، و دیگر بزرگان قوم نے جو ہمدردی فرمائی۔ وہ میرے دل پر نقش ہے

گی۔ ان میں سے بعض دل خود چوٹ کھائے ہوئے تھے۔ اس لئے اپنے دلوں سے جو نکلا وہ دل ہی میں دبا کر بیٹھا۔

اردو لٹریچر کے سرمایہ افتخار اور ہماری جان بلب شاعری میں نئی روح پھونکنے والے مولانا حالی نے تعزیت کے خط میں کچھ تو اس دل جوشی کے اقتضا سے جو انہیں ان اور ان کی فطرت کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرنے کی وجہ سے اکثر تحریک کرتا رہتا ہے۔ اور زیادہ تر اس اہلیت میں میرا دل ہلانے کی غرض سے ایک نظم مرحومہ نے فرمائی ہے۔ جو کہ اس دفعہ درج کی جاتی ہے۔ اس نظم نے میرے جراحت دل پر مرہم کا کام دیا ہے۔ مگر خدا نے کتنے دلوں میں ناسور ڈال دیے گی۔ اور کتنے دلوں کو ہرا کر دے گی۔ ایک اور میرے لئے باعث تسکین یہ ہے کہ وہ خدائے بزرگ و برتر نے دیکی مشیت میں ہم کچھ دخل نہیں دے سکتے۔ میرا ایک بھائی چھین لیا۔ لیکن اس کے ساتھ اپنی خاص رحمت سے ایک ایسا قوت بازو اور دکھ درد کا شریک ہر کام میں ہاتھ بٹانے والا دوست دیا۔ جسے میں اپنے حق میں حق کی طرف سے ایک خاص عطیہ سمجھتا ہوں۔ وہ مولوی محفوظ علی صاحب علی گڈھ کے ایک سربرآوردہ گریجویٹ اور دولت آصفیہ کے ایک بڑے محکمہ کے عہدیدار ہیں۔ جن کے مضامین دکنی دیولیو کے ناظرین کی نظر سے گذرتے رہتے ہیں۔ اب "دکنی دیولیو" کی ایڈیٹری میں میرے شریک ہوتے ہیں۔[1]

1۔ "دکن دیولیو" 1904ء کے رسالے میں محمد اکبر خاں (جو کہ مولانا محفوظ علی خاں کے بھائی تھے) نے 16 جون 1904ء کو صبح کے وقت لاہور میں انتقال کیا تھا۔ تعزیتی پیغامات کے سلسلے میں

مولانا ظفری خاں کی نظمیں بھی "دکن ریویو" میں چھپتی تھیں۔ جو کہ ان کے مجموعہ "بہارستان" میں موجود ہیں۔ اس رسالے میں لکھنے والے مضمون نگاروں کے نام جو نظر کے سامنے آتے ہیں۔ ان میں مولانا سید کرامت حسین بیرسٹر، مولوی عزیز مرزا، سید ہمایوں مرزا بیرسٹر، مولوی صدیق حسین عاشق پروفیسر نظام کالج، امام الدین احمد آزرد، مولوی مشتاق حسین، مرزا سلطان احمد اشرف، حسین، مولوی محمد اختر، ڈاکٹر عبدالحق، سید محفوظ علی، نورالدین چیف جسٹس، درگا سہائے، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی اکبر حسین، ڈاکٹر اقبال بی اے ہیں۔ ان ناموں کے علاوہ کچھ اور نام ہیں جو کہ اس طرح سے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی، عبدالحلیم شرر، ضامن کنتوری، مولوی فضل حق آزاد، سرشار اور سرکشن پرشاد کے نام بھی بہت اہم ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام لکھتے ہیں۔

"جولائی 1902ء میں یہ رسالہ "اضانہ" کے نام سے جاری ہوا۔ پھر جنوری 1904ء میں رسالہ "دکن ریویو" کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔ مارچ 1905ء میں ایک سال کی چھٹی لے کر سید محفوظ علی صاحب کے پاس صومالی لینڈ چلے گئے۔ ان کی چھٹی اغلباً جولائی 1905ء سے شروع ہوئی اور اکتوبر 1906ء کو ختم ہوئی۔ نومبر 1906ء میں انھوں نے ایک نمبر اس کا بمبئی سے بھی نکالا۔ بہرحال واپس آکر نومبر 1906ء سے لے کر مارچ 1909ء تک یہ پرچہ نکلتا رہا" [1]

---

1. ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ کاروانِ صحافت، انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔ ص 124

اس کے بعد وہ آگے لکھتے ہیں۔

"فروری کے مہینے میں انھوں نے مضمون نگاروں کے لئے نقد معاوضہ کا بھی اعلان کیا تھا۔ لیکن بعض حالات کے پیش نظر انھیں اس رسالے کی ادارت اور ملکیت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اپریل 1909ء سے اس کی ادارت اور ملکیت مولانا مودود احمد قادری کے سپرد کر دینی پڑی۔ اور اعلان کیا کہ "وکٹن دیولیو" کی قدیم پالیسی کو قائم رکھیں گے"[1]

"اکتوبر 1909ء کو خود انھیں ہمیشہ کے لئے حیدر آباد کو خیرباد کہنا پڑا"[2]

اگست 1910ء میں مولانا ظفر علی خان نے "پنجاب دیولیو" کے نام سے پہلا شمارہ کرم آباد سے نکالا۔ یہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے چھپتا تھا۔ اس رسالے کے دو شمارے ملے ہیں۔ لائبریری لاہور میں محفوظ ہیں۔ جس میں ایک شمارہ اکتوبر 1910ء کا ہے۔ جو کہ پہلی جلد کا تیسرا شمارہ ہے۔ اور دوسرا شمارہ مئی۔ جون 1911ء کا ہے۔ (جلد اول شمارہ 10، 11) پہلے شمارہ کی مندرجہ ذیل تفصیل جو کہ اسی طرح سے ہے۔

1۔ ایڈیٹوریل — از ایڈیٹر

اس میں مندرجہ ذیل امور پر اظہار خیال کیا گیا۔

(ا) ایران و انگلستان کے باہمی تعلقات کا انقطاع۔

(ب) لارڈ منٹو وائسرائے ہند کی الوداعی تقریر۔

(ج) انڈیا آفس کی صدارت سے لارڈ مارلے کا استعفیٰ۔

1۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ کاروان صحافت۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی ص۔ 121

2۔ ظفر علی خان۔ اداریہ۔ زمیندار ہفتہ وار لکھنؤ 1910ء کرم آباد

(د) وائسرائے کی انتظامی کونسل میں سید علی امام کا تقرر۔

2. المرابطین (۲) — از ایڈیٹر
(اسپین کے مسلمان فرماں رواؤں کے
عروج و زوال کی داستان جو دوسری
قسط میں مکمل ہوئی)

3. غزل — خواجہ الطاف حسین حالی

4. گلبرگہ شریف (تاریخی مضمون) — مولوی معشوق حسین

5. نعت — مولوی محمد جعفر خیرآبادی

6. ہز ایکسی لینسی لارڈ منٹو کی الوداعی تقریر (ترجمہ از ایڈیٹر)

7. تاجِ سخن پر منظوم دیوان — مولانا حسن مرتضیٰ شفق عمادپوری

8. میاں (لفظ "میاں" کی تحقیق) — سید محفوظ علی

9. غزل — سید تفضل حسین فطرت

10. کوا (نظم) — مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی

اسی طرح سے دوسرے شمارہ کی تفصیل بھی مندرجہ ذیل ہے

ایڈیٹر دیل — ایڈیٹر

اس میں مندرجہ ذیل امور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

(ا) مولوی چراغ علی اور ان کی تصنیف "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام"

(ب) ڈاکٹر سید علی بلگرامی کی وفات

(ج) جسٹس شاہ دین ہمایوں کی سخن سرا

MAULANA AZAD LIBRARY
ACC. No. T4581
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH

(د) پنجاب یونی ورسٹی کی طرف سے علمی خدمات پر انعامات ۔

2۔ نواب اعظم یار جنگ مرحوم — مولوی عبدالحق

(یہ وہ مضمون ہے جو اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام میں بطور مقدمہ شامل ہے)

3۔ نعت ۔ — کامل فتح پوری اکبر آبادی

4۔ ترانہ تہنیت جشن تاج پوشی حضور ملک معظم — مولوی سید فضل حق آزاد

5۔ امام بخاریؒ — مولوی سید ابوالحسن (بھوپال)

6۔ امت ۔ — مولوی عبداللطیف کلکتہ ۔

7۔ غزل ۔ — علامہ شبلی نعمانی

8۔ نوید مسیحا (مقالہ) — مولوی حمیدالدین ۔

9۔ نغمۂ نے (نظم) — سفیر (لکھنؤ)

10۔ سلاطین مغلیہ کے سکوں کے ابیات (مقالہ) — ایڈیٹر

11۔ غزلیات — شاہ دین ہمایوں و مولوی تفضل حسین فطرت

12۔ یونیورسٹی کی تحریک (نظم) — سکیر الطاف احمد آزاد سہارن پور

13۔ غزل — مسٹر غلام رسول مہر اسلامیہ کالج لاہور

14۔ انگریزی زندگی کی ایک دل ربا جھلک ایڈیٹر

(انگریزی سے ترجمہ "باقی داود")

1903ء میں ایک اخبار "زمیندار" لاہور سے مولوی سراج الدین احمد نے (جو کہ مولانا ظفر علی خاں کے والد تھے) نکالا۔ 1903ء میں مولوی سراج الدین احمد محکمہ ڈاک کشمیر سے تقریباً تیس (30) سال کی طویل مدت کے بعد جب سبکدوش ہوئے تو انھوں نے ملکی اور ملی مفاد کے لئے اخبار کے اجرا کو پسند کیا۔ تعلیمی، سیاسی اور مذہبی معاملات میں بڑی حد تک وہ سر سید احمد خاں کے پیرو تھے کیونکہ وہ کبھی کبھی "تہذیب الاخلاق" میں اپنے مضامین شائع کراتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب ادیب بھی تھے اور شاعر بھی اور خود زمیندار تھے اور زمینداروں کی پستی اور جہالت کے اسباب سے بے خبر نہ تھے۔ اس وجہ سے بہت سوچ سمجھ کر اخبار نکالا۔ یہ اخبار اس لئے نکالا کہ زمینداروں کے لئے کچھ تو فائدہ مند ثابت ہو۔ اخبار کا نام "زمیندار" رکھا۔ اس اخبار کی پیشانی پر ایک شعر نظر آتا تھا ؎

نام کو تو ہوں زمیندار اور اگر سوچو ذرا
قوم کا راحت رساں ہوں قوم کا مشکل کشا۔

زمیندار کا پہلا پریس سوچ دروازہ چوک نواب صاحب کے متصل ایک گلی سے نکلا اور کچھ مدت بعد اس کو کرم آباد سے نکالنا شروع کیا۔ اور دفتر کے پاس ایک کمرے میں کرایہ کا پریس لگایا۔

اس جگہ "زمیندار" ان کی زندگی کے آخر لمحہ تک چھپا۔ اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کے مضامین اور خبریں سب وہ اکیلے ہی مرتب کرتے تھے۔ پنجاب ایکٹ کے خلاف ایک طویل نظم ہاؤہ (فریاد) جو چودھری شہاب الدین نے پنجابی زبان میں لکھی تھی، اسی اخبار میں شائع ہوئی۔

مولوی سراج الدین احمد نے اس اخبار کے ذریعہ زمینداروں کی بہت ہی خدمت کی۔ اور آخر کار چھ سال لگاتار دماغی محنت اور ادارت کی شدید ذمہ داریوں نے ان کا جگر اور معدہ کمزور کر دیا۔ اس وجہ سے مولوی سراج الدین احمد کام کرنے کے قابل نہ رہے۔ اس زمانے میں مولانا ظفر علی خاں کا تعلق ریاست حیدرآباد کی ملازمت سے ختم ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے وہ لاہور آ گئے تھے۔ مولوی سراج الدین احمد کا علاج ڈاکٹر بیلی رام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر بیلی رام نے مولانا ظفر علی خاں سے کہا کہ ان کو کرم آباد لے جاؤ تاکہ وہاں آرام کر سکیں۔ علاج اب بے فائدہ ہے۔

مولوی سراج الدین احمد نے مولانا ظفر علی خاں (جو کہ ان کے بڑے بیٹے تھے) کو وصیت کی کہ میرے بعد "زمیندار" کو زندہ رکھنا۔ میں نے اس کو خونِ جگر سے سینچا ہے۔ ان کا انتقال 9 نومبر 1909ء کو کرم آباد میں ہو گیا۔ ان کے بعد ظفر علی خاں نے ہفتہ وار "زمیندار" کی ذمہ داریاں خود سنبھال لیں۔

یکم جنوری 1910ء کو اس کا پہلا ایڈیشن نئی ادارت میں کرم آباد سے اپنی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ اس اخبار کو انھوں نے محنت کے ساتھ چلایا۔ اور اس سلسلے میں جو تکلیفیں اور عظیم مالی نقصان برداشت کئے وہ اردو صحافت کی تاریخ میں ایک یادگار مثال ہے۔

جب تک مولانا زندہ رہے اخبار اسی آب و تاب کے ساتھ پہلے
کرم آباد سے پھر لاہور سے نکلتا رہا۔ جنوری 1953ء میں اس اخبار نے اپنی
خدمات سے متعلق مضامین پر مشتمل ایک دیدہ زیب اور باتصویر گولڈن جوبلی
نمبر نکالا۔ ایک طویل شذرے میں مولانا ظفر علی خاں نے اپنے والد سراج
الدین احمد کے اخبار "زمیندار" کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کس طرح ان
کے دادا مولوی کرم الٰہی نے 1882ء میں وزیر آباد سے 22 میل دور زمین خرید کر
اپنے نام پر کرم آباد کی بستی آباد کی تھی۔ ان کے والد مولوی سراج الدین احمد
نے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر "زمیندار" کے نام سے ایک ہفتہ وار
اخبار جاری کیا۔ بعد میں میاں محمد شفیع سے مل کر "زمیندار ایسوسی ایشن" قائم کی
جس کا مقصد یہ تھا کہ زمینداروں کی بھلائی کے کام کئے جائیں۔ "زمیندار" اخبار
کے بارے میں مولانا ظفر علی خاں نے لکھا ہے۔

"اس شخص نے کمر ہمت باندھ کر وہ کام اپنے ذمہ لیا۔ جس کی
مشکلات کا تصور کرتے ہوئے ہر قلب ڈرتا ہے۔ سب سے پہلے اپنے
اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لحاظ سے اس نے ایک اخبار بنام
"زمیندار" جاری کیا۔ اور اس کے ذریعہ سے اپنی آواز جو گم کردہ
راہ کارواں کے لئے بہ منزلۂ بانگ درا تھی "زمیندار" تک پہنچانا
شروع کی۔ یہ آواز اول اول بہت ہی دھیمی اور مدھم تھی۔
لیکن رفتہ رفتہ بلند اور پاٹ دار ہو گئی۔ یہاں تک کہ دشت
و جبل اور وادی و کوہسار اس سے گونج اٹھے اور ایک اخبار

"زمیندار" نے چند سال کے عرصہ میں وہ کام کیا جو بڑی طاقت نے
حریفوں سے انجام نہ دیا تھا۔ زمیندار اہل پنجاب میں حرکت اور
بیداری کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ اپنی حالت اور حیثیت اور وقعت
سے آگاہ ہو گئے۔ وہ ان حقوق کا جو مدت ہائے مدید سے یا تو نظر انداز
ہوتے چلے آتے تھے یا پامال کئے جا رہے تھے۔ مطالبہ کرنے لگے۔ ان
میں شدت علم پیدا ہو گئی۔ ان میں زندگی کی نشانیاں نظر آنے
لگیں اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ادنیٰ کرشمہ اس نئی
روح کا جو اس اخبار نے زمینداروں پر بلا لحاظ مذہب و ملت
(اور یہ بات کا سب سے بڑا کارنامہ ہے) پھونک دی۔ یہ تقاضا قانون
نو آبادی ہائے پنجاب سے انھوں نے اپنے لئے مضر سمجھا تھا۔
علی الرغم مخالفین لارڈ منٹو کی عنایت سے نافذ ہوتے ہوتے
رہ گیا۔"[1]

مولانا ظفر علی خاں نے اپنے والد مولوی سراج الدین احمد کے انتقال
کے بعد "زمیندار" کی ادارتی ذمہ داریوں کو پورے طور سے سنبھال
لیا۔ اسی درمیان ان کو "پیسہ اخبار" (لاہور) "وکیل" (امرتسر) اور
اسلامیہ کالج (لاہور) کی طرف سے بھی ملازمت کی پیش کش کی جا چکی
تھی۔ لیکن انھوں نے ہر جگہ ملازمت سے انکار کر دیا۔ کیونکہ انھیں اپنی
ذمہ داری آزادی کے ساتھ اپنے اخبار "زمیندار" کو جاری رکھنے پر
قائم رہنا تھا۔

---

[1] ظفر علی خاں۔ اداریہ "زمیندار" حیدرآباد دکن، ۱۰ اپریل ۱۹۰۹ء

انھوں نے یکم جنوری 1915ء کو اس اخبار کے دورِ ثانی کا آغاز کراچی آباد سے کیا۔ اور وہی پالیسی اختیار کی۔ جس کے تحت مولوی سراج الدین احمد نے اس اخبار کو جاری کیا تھا۔ اس اخبار کی کافی شہرت ہو گئی تھی۔ مولوی سراج الدین کی انتقال کے بعد اخبارات نے ان کی قومی خدمات کا ذکر اہم طریقے سے کیا تھا۔ اور انھیں ان کی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔

اس اخبار "زمیندار" کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی ظفر علی خاں نے اس کی ادبی اور علمی حیثیت کو کہیں بلند مقام پر پہنچا دیا۔ اس اخبار کو ادبی اور علمی حیثیت اس وجہ سے بھی ملی کہ نثر نگاری اور اداریہ نویسی میں "دکن ریویو" کے تجربات نے ان کے قلم میں اس قدر زورِ بیان پیدا کر دیا تھا۔ کہ ان کی ادبی اور صحافیانہ صلاحیتیں ایک ہفتہ اخبار سے کہیں بڑھ کر ایک نئے میدان کی تلاش میں تھیں۔

"زمیندار" 1911ء کی فہرستِ مضامین اور اس کا سرورق۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

زمیندار

جلد دوم (۲) کراچی آباد۔ یکشنبہ یکم جنوری 1911ء مطابق 29 ذی الحج 1328ھ۔ موافق یکم اسفندیار 1320 ف نمبر

فہرست مضامین۔

یاد کی تجویز۔ نیشنل کانگریس

ہز ہائی نس آغا خاں کی یادگار تقریر۔ ایک مبارک انقلاب کے آثار

زاولی بیگم کا قصہ۔ زمینداران پنجاب کا قصہ۔

مسلمانوں کے تنزل کے آثار۔ مسلمان اور شراب۔ مسلمانی در کتاب

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اور عبداللہ یوسف علی کی

تقریر۔

مجوزہ مسلم ہندو کانفرنس

قانون نو آبادیات پنجاب

استہارات

پرنٹ لائن

دفتر اخبار زمیندار۔ سرگودھا سے باہتمام ظفر علی خاں بی۔اے

مالک و ایڈیٹر شائع ہوا۔

مطبوعہ رضا عام۔ اسٹیم پریس۔ لاہور

ہفتہ وار "زمیندار" کے اداریے۔

(1)	پہلی کا دم دار ستارہ (علمی اداریہ)	یکم فروری	1910ء
(2)	امپیریل لیجسلیٹو کونسل کا پہلا اجلاس	8 فروری	1910ء
(3)	روس اور جاپان کے تعلقات	16 فروری	1910ء
(4)	آفت پر آفت (زمینداروں کے متعلق)	22 فروری	1910ء
(5)	افریقہ میں اشاعت اسلام	یکم مارچ	1910ء
(6)	آبادی نہر چناب کے دو اسکان	8 مارچ	1910ء

(7) مہتمم بندوبست کی ذمہ داری۔ 16 مارچ 1910ء

(8) وزیرآباد کی میونسپل کمیٹی۔ 23 مارچ 1910ء

(9) ایک ہندوستانی لیفٹیننٹ گورنر۔ 30 مارچ 1910ء

(10) شہنشاہ نجاشی۔ 8 اپریل 1910ء

(11) مولوی سراج الدین احمد کا آخری اداریہ۔ 16 اپریل 1910ء

(12) انسان کامل کی شان الوہیت۔ 23 اپریل 1910ء

(13) آنریبل خواجہ احمد شاہ اور تعلیم۔ 8 مئی 1910ء

(14) قیصر ایڈوارڈ کی دولت (نظم و نثر میں)۔ 16 مئی 1910ء

1911ء کے اداریے۔ از یکم جنوری 1911ء تا اگست 1911ء تک

(1) دیکھ کر آنا 16 جنوری 191ء

(2) ہماری یونی ورسٹی 11 فروری 191ء

(3) بے آزادی یہ یاگستاخی

(4) پنجاب اور اسلامی یونی ورسٹی کا غیر مقدم (پروونشل کمیٹی نواب فتح علی خاں قزلباش کو مبارک باد 9 کا کل اداریہ)

(5) رحمۃ اللعالمین کی سالگرہ (یا خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار)

(6) وزیرآباد لیجسلیٹو کونسل میں (ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے)

(7) نوید غیر مقدم قیصر۔

(8) کیا ہمارا تمدن مہذب ہے؟

(9) دادرما کا نابے نومن تیل کے بغیر (مسودۂ قانون پنجاب)

(10) انجمن اتحاد و ترقی مسلمانانِ پنجاب

(11) مضمون سر سید احمد خاں

(12) سائنس و ندوات

(13) ایک مسلمان۔ ڈی۔ ایس۔ پی پر ہندو پریس کی پوشش

(14) ابتدائی تعلیم کا مسودۂ قانون از گوکھلے

(15) ابتدائی تعلیم نمبر ۲

(16) مسلم یونی ورسٹی قابلِ توجہ معزز اراکین مسلم یونی ورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی۔

مولانا ظفر علی خاں کی انشا پردازی کا اندازہ ہم ان کے ایک اداریے (ان دیکھے کسان) کے درج ذیل اقتباس سے لگا سکتے ہیں۔

صانعِ قدرت کے عظیم الشان کارخانہ میں ہوا، بادل، چاند، سورج جیسی زبردست قوتوں یا طاقتوں کو مزدوری کرتے ہوئے دیکھ کر سقیوں نے آج سے چھ سو (600) سال پہلے انسان کو یہ سبق دیا تھا ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

لیکن شیراز کا سکندر دس شاعر اس زمانے میں موجود ہوتا۔ جب کہ انسان کی عقل دقیقہ سنج کو ذرہ میں آفتاب اور قطرہ میں طوفان کا تماشہ نظر آتا ہے، اور جب کہ غیر محدود بڑائی کی طرح محدود

چھوٹائی میں انگنت جان داروں کی بے حساب دنیا میں دریافت ہوگئی ہیں۔ جن کی آنکھوں سے اوجھل اور قیاس سے باہر آبادی ہماری خاطر نوں پر ہینہ ایک کر دیتی ہے۔ تو شاعر اپنے معرفت آموز قول کی دوسری کو حقیقت نفس الامر کے قریب پاتا۔

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار
شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں بری

وہ کارندگانِ عالم جن کی قوتوں کا صحیح صحیح اندازہ انسان اب کرنے لگا ہے، جراثیم ہیں۔ جن کا آج سے دو سو (200) سال پہلے تک علومِ جدید کے ماہروں کو علم تک نہ تھا۔ ان کی کارگزاری اور اثرات پر تو پچاس (50) میں نظر ڈالی جانے لگی ہے۔ جراثیم آنکھ سے نظر نہیں آتے اور ایسے باریک ہوتے ہیں کہ نگاہ خوردبین کی مدد سے بھی ان کا مطالعہ صرف اسی حالت میں کر سکتی ہے۔ جب کہ یہ انبار در انبار ایک جگہ موجود ہوں۔ ماہرین علم جراثیم کی سمائی ہو سکتی ہے۔ ابھی تک صحیح طور پر یہ دریافت نہیں ہوا کہ یہ حیوان ہیں یا از قسم نباتات۔ ان کی ایک قسم حیوانی اور نباتی مادہ پر اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔ اور اس قسم کا گزارہ مادی عنصر پر ہوتا ہے۔ شکل ان کی سیدھی سادھی ہوتی ہے بعض گیہوں کی طرح گول ہوتے ہیں۔ بعض چھری کی طرح لمبے۔ بعض کی شکل کاٹو دم ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض متحرک ہوتے ہیں یعنی ساکن۔ ان کی حرکت ان کے نازک روؤں کی مدد سے پیدا ہوتی ہے۔ اور

ان کے بڑھنے کا طریقہ ایسا سادہ ہے کہ اس سے زیادہ سادہ طریقہ
قیاس میں نہیں آ سکتا۔ یعنی ایک حیات زندہ سے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔
اگر حیات معتدل ہو اور غذا مناسب مقدار میں میسر آتی رہے تو وہ پندرہ
کر ہر آدھ گھنٹہ کے بعد شق ہو سکتے ہیں۔ افزائش کی اس اختیار سے
با آسانی ثابت ہو جاتا ہے کہ اکیلے جرثومے کی اولاد چوبیس گھنٹے
کے اندر ایک کروڑ ستر لاکھ کی تعداد کو پہنچ سکتی ہے۔ اس حد درجہ چھوٹائی
پر بھی اگر یہ برابر اس اختیار سے بڑھتے رہیں تو دنیا میں بہت جلد جرثومے
کے اور کسی مخلوق کی گنجائش نہ رہے گی۔ لیکن غذا کی کمی اور دوسرے
اسباب کی ناسازگاری سے ان کی افزائش کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔
"زمیندار" نے ایک اداریہ "بے آزادی ہے یا گستاخی" پر (انڈین ویلڈ
نے ہم علم پنجابی" 21 فروری 1911 کے اخبار میں تائید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ
صلح و آشتی کی ابتدا ہندوؤں کی طرف سے ہوئی تھی۔ دوسرے یہ گورنمنٹ نے
ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنانے کے لئے جس آلہ سے کام لیا وہ
سر سید احمد خاں تھے۔ جنہیں ملکی فلاح و بہبود سے کوئی کام نہیں تھا۔ بلکہ وہ حکام
کے ساتھ بمنزلہ ایک کٹھ پتلی کے تھے) اس کے جواب میں "زمیندار" نے انڈین
ویلڈ کی تردید کی۔

مغربی تہذیب جن نرالے خیالات کو ساتھ لئے انگلستان سے چل کر
ہندوستان پہنچی۔ ہندوستان میں جو خیالات ہزارہا سال سے پھیلے
ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نئے خیالات ٹکرائے اور قدیم و جدید

کے تخیل اس مڈھ بیٹر نے عجیب طوفان بے تمیزی برپا کر دیا۔ جس
طرح روزنِ دیوار میں جھانکتے ہوئے سورج کی کرن میں ذرہ ناچتا ہوا
نظر آتا ہے۔ اسی طرح مغربی تمدن کی روشنی میں مشرقی تہذیب کے
بے تابانہ رقص کا نظارہ اربابِ بصیرت کو نظر آنے لگا۔ اس کی
گردن پر جو دھیں زناٹا پڑا تھا۔ نکٹائی نے قبضہ کر لیا۔ اس کی کمر کو
جس میں دھوتی تانہ بند لپٹا دیتا تھا۔ پتلون نے مسخر کر لیا۔ اس
حویلی کی جگہ جس کی چار دیواری کے اندر نامحرم کی نگاہ نہ جا
سکتی تھی۔ بنگلے نے لے لی۔ جو ہر طرف سے چشمِ عاشق کی طرح کھلا
رہتا ہے۔ مشرق و مغرب کا تصادم اپنے اثرات کے لحاظ سے یہیں
تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ ہندوستانیوں یا یورپ ہی کو زیر دے
سکتی تھی۔ اس کی ایک تاثر انگیز جھلک ہمیں معاصر "پنجابی"
کے 4 فروری کے لیڈر میں نظر آتی ہے۔ جو اس بحث کے لئے وقف کیا گیا
ہے کہ موجودہ ہندو مسلم اختلاف کس طرح ہوئے۔ ہمارے معاصر
نے اس لیڈر میں انڈین ورلڈ کے ایک نامہ نگار کی ہم آہنگی اور
ہم صفری کا حق ادا کر دیا ہے۔ جو کانگریسی کا بہت ہی بڑا
شیدائی معلوم ہوتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں نے اسی موضوع پر پریس کی آزادی کی اس بے
داد روی پر توجہ دلائی اور لکھا۔

"اگر پریس کی آزادی کے یہی معنی ہیں کہ حکومتِ وقت ہر

اس قسم کے الزامات باندھے جائیں تو ایسی آزادی کو دور ہی سے سلام ہے۔ یہ شوخ چشمی ہے گاؤدیدگی ہے۔ بلکہ سرکشی ہے۔

سرسید احمد خاں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"سرسید احمد خاں کی ذات بابرکات سے ملک کو جو فیض پہنچا ہے۔ اسے ایک زمانہ جانتا ہے، باقی اپنی یہ بات کہ ہمارے لکھنے سے پنجابی اور انڈین ورلڈ کے دل سے یہ بات نکل جائے کہ سرسید ملک کے دشمن تھے۔ اور وہ آئے دن انھیں برا کہنے سے باز آجائیں سو بحال ہے بے چارے سرسید احمد خاں کس شمار و قطار میں ہیں۔"

مسلم یونیورسٹی پر ایک اداریہ 16 اگست 1911ء کے ہر چہ میں شائع ہوا۔ اس اداریہ میں مسلم یونیورسٹی کا نٹی ٹیوشن کو خاص طور سے توجہ دلائی گئی۔ اس میں سے صدر ذیل اقتباسات پیشِ نظر ہیں۔

ہندوستان میں جو زبردست دماغی ہل چل کچھ مدت سے پڑی ہوئی ہے اس کا سب سے زیادہ خوش آئند کرشمہ وہ عدیم النظر دل چسپی ہے کہ ان کی ایک قومی یونیورسٹی ہونی چاہیے۔ مسلم یونیورسٹی کے تصور کا بیج سرسید احمد خاں کی آنسوؤں کی آبکاری سے اگا۔ ان کے ہم چشموں کی عرق ریزی نے سینچا.... ان کے جانشینوں کی جاں فشانیوں نے بڑا ہوا ہے۔ اور اب ان سات کروڑ مخلوق کی دلی تمنائیں اسے اس برگ و بار لانے کو ہیں۔ جن کے دل احسان پذیر

میں ان کی اطمینان آفرین یادگریں ہیں۔ مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا مذہب ہے۔ ان کا کھانا پینا، اٹھنا، سونا، جاگنا، جینا مرنا سب مرکزی احکام کے تابع ہیں۔ اپنوں کے ساتھ ان کا سلوک، بیگانوں کے ساتھ ان کا برتاؤ حکومتِ وقت کے ساتھ ان کا طرزِ عمل ایک معینہ مذہبی ضابطے کے ساتھ وابستہ ہے۔ انھیں یہ ہدایت کرتا ہے کہ اگر حاکمِ وقت تمہاری مذہبی آزادی میں مخل نہ ہو تو خواہ وہ جیسی بھی ہو اس کی کورانہ اطاعت کرو۔

موجودہ یونیورسٹیوں میں نوجوانوں کو تعلیم دلوا کر یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے وقت کی نمرآئی اور دازی وابن خلدون و بیاں والی اللہ اور سرسید احمد یا شبلی یا حالی بنیں گے۔ یہ خیال ایسے ہی ہے جیسے جو بو کر گیہوں کاٹنے کی امید کرتا ہے۔ یا کانٹے بو کر پھول چننے کا خیال کرتا ہے۔ ایک اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان سے بہتر جن باتوں کے موقع ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

(1) صوم و صلوٰۃ کا سختی سے پابند ہو اور دوسرے شعائرِ اسلام کا بھی بالالتزام عامل ہو۔

(2) اسلامی تاریخ اور اسلامی لٹریچر سے بقدرِ وافر بہرہ اندوز ہو۔

(3) اردو کے علاوہ جس میں وہ اپنے خیالات کے ادا کرنے میں پورا قدرت رکھتا ہو۔ عربی میں بھی اسے اس حد تک دستگاہ ہو کہ بلا تکلف اس زبان کو بول سکے۔ اس کے علاوہ پورپ کی ایک

زبان میں بھی ایسے مہارت تامہ دکھنی لازم ہے۔

(ب) مغربی علوم نظری اور طبعی پر اسے عبور حاصل ہو۔

(ج) کسی ایک معاش کے فن کا ماہر ہو تاکہ عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکے۔

اس اخبار میں مسلم لیگ کی کارروائیاں اور اس کی تفصیلات بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔ مثلاً سر آغا خاں کے اجلاس مسلم لیگ کی تقریر بھی تفصیلاً شائع ہوئی۔ اسی طرح مختلف کتابوں اور دواوین پر تبصرے اور دیباچے بھی شائع ہوتا مثلاً۔ آصف اللغات، کلام فوق، غنچہ بہار، دیوانِ وحشت اور رسائل میں دل گداز اور زمانہ کا دیباچہ نکلے۔ یکم مئی 1911ء سے ہفتہ وار "زمیندار" لاہور سے نکلنے لگا۔ اس سلسلے میں جو کچھ محسوس کیا اس کو انھوں نے اداریہ کی شکل میں بیان کیا۔

منظور ہے گزارشِ احوال واقعی
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

خدا کا نام لے کر پھر لاہور آ گئے اور ہیرا منڈی میں ایک مکان لے لیا۔ جس کے ایک طرف بادشاہی مسجد ہے۔ دوسری طرف ایک شوالہ ہے۔ لیکن خدا کا گھر بھی چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ اور مہادیو جی کے استھان کی دیوار سے تو غریب خانے کو نسبتِ اشتراک حاصل ہے۔ بادشاہی مسجد کے سر فلک میناروں کے اور اس کی پنج وقتہ اذان کی صدا کو بلحاظ اتصال مکان و زبان چشم گوش سے پھر

بھی ایک طرح کی اعتبادی مغائرت ہے۔

یکم مئی 1911ء سے ہفتہ وار "زمیندار" لاہور سے نکلنا شروع ہوا اور اس کو لاہور سے نکالنے کا طریقہ کرم آباد سے مختلف تھا۔ اس نے اپنی اہمیت کا احساس اپنے اداریوں اور اہم مختصر نوٹس اور خود ظفر علی خاں اور دوسرے لوگوں کی نظموں کے ذریعے دلانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے زمینداروں اور کسانوں کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ پوری ملت اسلامیہ کے احساسات و جذبات کو اپنا اہم فریضہ قرار دیا تھا۔

دسمبر 1916ء میں ظفر علی خاں نے گورنمنٹ سے ایک غیر سیاسی اخبار نکالنے کی اجازت لی اور انھوں نے "ستارہ صبح" کے نام سے پہلا روزنامہ 8 اگست 1917ء کو کرم آباد سے شائع کیا۔ دوسرا نمبر 28 اگست 1917ء کو جلد نمبر 1 شمارہ نمبر 2 جاری ہوا۔ اس اخبار کے صفحہ اول کا نمونہ کی تفصیل اس طرح سے ہے۔

دَبِّ ذوِی عُلا

من آں ستارہ صبح کہ در محل طلوع سپیدہ جبینی دہد آفتاب می باشم

ستارہ صبح روزنامہ

ایڈیٹر ظفر علی خاں

جلد اول لاہور یوم سہ شنبہ 9 ذی قعدہ 1335ھ مطابق 28 اگست 1917ء نمبر 2

ستارہ صبح (نظم)

(مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی کے قلم سے)

اس اخبار کی ادارتی ذمہ داریاں بلند لوگوں پر تھیں۔ جیسے جناب اختر علی خاں، علامہ عبداللہ عمادی، سید وحید الدین سلیم پانی پتی، مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی، خواجہ عبدالحی، مرزا امان اللہ خاں وزیر آبادی اور مرزا سید بیگ جیسے اصحاب علم اور اہل قلم تھے۔ یہ اخبار اپنی طرز کا انوکھا تھا۔ اس کے اندر علمی اور ادبی مضامین ہوتے تھے۔ اور اس کے عنوانات، اداریے اور مضامین سب علمی و ادبی مسائل پر مشتمل ہوتے تھے۔ اس اخبار کے عنوانات مندرجہ ذیل تھے۔

(1) جواہر ریز
(2) جنگ فرنگ
(3) ریویو کی برق خرمن
(4) مغربی بزم گاہ
(5) فکاہیات
(6) حدیث دیگراں
(7) بزم گاہ صوفیہ
(8) شریعت و طریقت اور قادیانیت
(9) ادبیات عرب
(10) اردو کی حمایت
(11) ادبیات اسلام

جواہر ریز کے تحت خصوصیات سے ان کی وہ نظمیں شائع ہوتی تھیں جو تصوف یا قادیانیت کے خلاف تھیں۔ ان کی ایک نظم جو کہ بیت ہے

دل چسپ تھی۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو "ستارۂ صبح" میں ایک نظم "وہ اور ہم" کے عنوان سے شائع ہوئی جس کے چند اشعار اس طرح ہیں۔

اب تک تو یہ سمجھے ہوئے تھے آپ کے دل سوز — ہے مسخرگی بزم حریفاں میں دل سوز

اب آپ کو وعظوں میں ہے اصرار اسی پر — اللہ نبی پر بھی کوئی وار ہو دل سوز

مذہب کی یہ تحریک ہو یہ ادب کی رو — پھر کیوں نہ ہو ملت کے لہو میں آب ادب آموز

ہوا نہ آپ اگر بنے ہیں شوق سے بنئے

ہمیں ہے کس واسطے وعظ ستر و زور

ستارۂ صبح کی ایک بڑی خصوصیت صوفی ادب میں لفظ سازی تھی۔ انھوں نے اپنے ادب میں نئے نئے الفاظ نئی نئی ترکیبیں اور نئی اصطلاحیں اس کثرت سے استعمال کی ہیں کہ صوفی ادب کی زبان ایک علمی زبان اور مستند زبان ہو گئی۔ اس اخبار میں ذوالحسن نظامی اور تصوف کے خلاف مسلسل اداریے نکلتے رہے۔ اور اسی کے ساتھ مرزا بشیرالدین محمود اور قادیانیت کے خلاف بے شمار مضامین نکلے۔ پیر پرستی کے خلاف بھی انھوں نے ایک محاذ قائم کر لیا تھا۔ اور دوسرا محاذ صوفی برادری کا تھا۔ ان کے خلاف دوسرے اخبار نویس اداریے اور مضامین لکھتے تھے۔ وہ ان حملوں کا کبھی بھی نہ ڈرے اور اپنی انھیں سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور میں پیر جماعت علی شاہ اور ان کے مریدوں کی طرف سے ایک میموریل ان کے خلاف تیار کیا گیا۔ جو کہ گورنر کو بھیجا گیا۔ انھوں نے اس میموریل کے خلاف ایک بہت ہی زبردست نظم "ستارۂ صبح" کی یکم مارچ ۱۹۱۳ء میں لکھی۔

ڈرا رہے ہیں وہ اپنے ہمورپل سے مجھے — ستارۂ صبح کا ہوں ڈر ہو کیا ذحل سے مجھے

ملی ہے دینِ محمدؐ کی سرمدی دولت — یہ زندگی ہے تو کیا خوف ہے اجل سے مجھے

جگر کے سوز سے آنکھ آشنا ہوئی ہے ابھی — نکالنا ابھی طوفاں ہے اک بغل سے مجھے

مجھے بھی نکتۂ تصوف کا ایک ہے معلوم — کہ لکھنے آتے ہیں مضمون دستِ شل سے مجھے

مرا یہ ہاتھ ہے اور داعیِ پیمبر ہے — یہ لازوال سعادت ملی ازل سے مجھے

میں آفتاب، یوں اسلام آسماں ہے مرا — وہ کیوں دکھاتے ہیں پھر روشنی کنول سے مجھے

ٹھہر گئی ہے مری آنکھ سبز گنبد پر — تو کیا غرض ہو کسی گوہرِ ہزخلل سے مجھے

حدیث نے مجھے پہنچا دیا ہے قرآں تک
کہ ذوقِ علم ملا ہے عمل سے مجھے

مولانا ظفر علی خاں یکم اپریل 1918ء سے "ستارۂ صبح" سے الگ ہو گئے ۶ اپریل 1918ء کو حیدرآباد آ گئے۔ حیدرآباد آنے کی وجہ یہ تھی کہ نظام حیدرآباد علی گڑھ آئے تو مولانا بھی ان کے ساتھ آئے۔ اس سفر سے واپس آ کر جو مقالہ افتتاحیہ آپ نے درج کیا تھا۔ اس سے واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ نظام نے ان کو عثمانیہ یونیورسٹی میں کوئی عہدہ دینے کا وعدہ کر لیا۔ 22 مارچ 1918 کو مسٹر محمد اکبر نظر علی ہوم سیکریٹری حیدرآباد کا ایک خط ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ "اعلیٰ حضرت نے ازراہِ خسروانہ ایک فرمان بدیں مضمون نافذ فرمایا ہے کہ آپ کو حیدرآباد بلا کر سابقہ عہدے پر بحال کیا جائے۔ مولانا ظفر علی خاں نے حیدرآباد پہنچ کر اپنے کام کا جائزہ لیا۔ حیدرآباد میں قیام بھی زیادہ عرصہ نہ رہ سکا۔ اور اکتوبر 1919ء میں حیدرآباد سے لاہور واپس آ گئے۔ یہاں آ کر پھر

سے اپنے اخبار "زمیندار" کو دوبارہ جاری کرنے کی ہونے لگی۔ اور آخر کار

25 اپریل 1920ء سے "زمیندار" کو دوبارہ نکالا۔

1919ء کے آخر میں کانگریس کا اجلاس امرتسر میں ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ کیونکہ ان کا نظربندی کا زمانہ ختم ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنے خلاف اعتراضات اور غلط فہمیوں کے جواب جلسہ عام میں دیئے

اگست 1920ء کو ایک تقریر حضرو میں کی اس کی وجہ سے وہ 7 ستمبر 1920ء کو گرفتار کر لیے گئے۔ اس وقت پنجاب میں مارشل لاء کے مظالم کی یاد دلوں سے نہیں نکلی تھی اور اسی زمانے میں تحریک عدم تعاون چل رہی تھی اور مولانا ظفر علی خاں اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اپنی پرجوش تقریروں سے سارے ہندوستان کو ہلا دیا۔ اس وجہ سے ان کو گرفتار کر کے اکتوبر 1920ء کو پانچ سال قید سخت کی سزا سنا دی گئی۔ اس طرح سے ان کی ادارت میں یہ اخبار اپریل سے ستمبر 1920ء تک نکلا۔ ان کے قید ہونے کے بعد دوسرے حضرات اس اخبار کو نکالتے رہے۔ اس میں جو اداریے مولانا ظفر علی خاں کے زمانے میں نکلے۔ وہ اس طرح سے ہیں۔

(1) عیسائیت سخت خطرہ کی حالت میں۔ 18 مئی 1920ء

(مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کے قلم سے)

(2) مشرق و مغرب کیا یہ دونوں آپس میں مل سکتے ہیں۔ 2 جون 1920ء

(3) مشرقی جان اور مغربی جان دونوں کی محبت کا فرق۔ 9 جون 1920ء

(4) اعلیٰ حضرت نظام الملک کا جدید فرمان اور مدیر زمیندار کی برطرفی کا حکم۔ 10 جون 1920ء

(5) ایک لفنگا کرنیل۔ 5 جولائی 1920ء

(6) سرحدی ڈاکے۔ 23 جولائی 1920ء

(7) لالہ لاجپت رائے اور کانگریس کا اجلاس خاص۔ 10 اگست 1920ء

(8) افریقہ کے بدنصیب ہندوستانی۔ 11 اگست 1920ء

(9) مہاجرین کی واپسی اور اس کی حقیقت۔ 28 اگست 1920ء

(10) مسٹر لائیڈ جارج حضرت غوث الاعظم کے دربار میں۔ 14 ستمبر 1920ء

(11) عدم تعاون اور مسلمان کونسلوں سے مطالبہ۔ 28 ستمبر 1920ء

(12) ہندوستانی وفد کی مراجعت (وفد خلافت) 6 اکتوبر 1920ء

اخبار "زمیندار" کا صفحہ اول پر سیاسی مضامین یا کسی خاص جلسے کی کارروائی اور مولانا ظفر علی خاں کی تقریر ترک موالات پر مولانا شوکت علی کے بیانات یا فکاہیات کے عنوان سے خود ان کی اپنی نظم ہوتی تھی۔ اس لئے پہلے صفحہ پر جو لکھا جاتا تھا۔ وہ اس طرح سے ہے۔

(1) "مدینہ میں سحر پر کیا گذری" (75 ہزار بھوک سے مر گئے)۔ 3 جون 1920ء

(2) حقیقی دوست کون ہے۔ عارف ہسوں۔ 10 جون 1920ء

(3) بمبئی کی افواہیں۔ از مولانا ابوالقاسم لاہوری۔ 16 جولائی 1920ء

(4) "پیغمبر قادیان کا ترانہ"۔ 22 جولائی 1920ء

(5) زمیندار کا اداریہ صفحہ اول پر از مولوی مظہر الدین تیرکوٹی۔ 15 اگست 1920ء

(6) مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار کی راولپنڈی میں پرجوش تقریر۔ 19 اگست 1920ء

(7) مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک خط از مولانا عبدالباری کے نام۔ 16 ستمبر 1920ء

(8) مولانا ظفر علی خاں کی گرفتاری۔ اخبار وطن سے۔ 24 ستمبر 1920ء

ہمدردی گوجرانوالہ میں عظیم الشان جلسہ۔

28 اکتوبر 1920ء سے 4 نومبر 1924ء تک مولانا ظفر علی خاں قید رہے اس عرصے میں اخبار کو مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر نکالتے رہے۔ 5 نومبر 1924ء کو مولانا ظفر علی خاں رہا ہوئے۔ ان کی رہائی کے بعد زمیندار میں ان کے ادبی مضامین اور نظمیں شائع ہوئیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) ادبی مضامین "تعزیات" لطائف الادب کے ضمن میں۔ 29 نومبر 1924ء

(2) سیاسی مضامین فسانہ حجاز کی طویل قسطیں۔ 30 نومبر 1924ء

(3) ظفر علی خاں کا پنجاب پروونشل خلافت کانفرنس 10 دسمبر 1924ء

امرتسر میں معرکۃ الآرا خطبہ 22 کالم میں شائع ہوا۔

(4) ادبی مضمون "شاہد قاچار"۔ اپریل 1925ء

(5) مولانا کا معرکۃ الآرا خطبہ امرتسر مئی 1925ء

"پیام حیات" کے نام سے

(6) خلیفۂ دوم پر ایک نظر۔ 10 جولائی 1925ء

مولانا ظفر علی خاں نے مئی 1925ء میں نثر اور اس کے علاوہ کبھی کبھی شوخ سخنی کے ضمن میں نظم بھی لکھیں۔ اور فکاہات کے عنوان سے بھی کبھی کبھی لکھ دیا کرتے تھے۔ 1925ء میں علامہ حسین ہمدانی مدیر "ضیافت پنچ" نے زمیندار اخبار

میں آگئے اور ان کے مزاحیہ مختصر نوٹ اور اس کے ساتھ ملّا دموزی کی گلابی اردو بھی اخبار کی زینت بنی۔

1927ء میں زمیندار نے اپنا ہفتہ وار ایڈیشن بھی نکالنا شروع کر دیا تھا۔ اس اخبار میں ایسے علمی اور ادبی مضامین شائع ہوتے جو عام معیار سے بلند ہوتے تھے۔ اسی سال زمیندار کے بڑے نام ایڈیٹر لال شاہ بزرگ تھے اور یہ اخبار اس وقت منصور اسٹیم پریس میں شائع ہوتا تھا۔ 1927ء میں جو زمیندار میں اداریے لکھے گئے وہ اس طرح سے ہیں۔

(1) غازمین حج کی مشکلات۔ 23 جنوری 1927ء

(2) حکومت پنجاب اور مسلمان۔ مسلمانوں کی تباہی پر ایک دل سوز اداریہ۔ 6 فروری 1927ء

(3) ابن سعود کو شوکت علی کا الٹی میٹم۔ (از ظفر علی خاں) 17 اپریل 1927ء

(4) مصیبت زدوں کی دست گیری کی فکر۔ (از ظفر علی خاں) 8 مئی 1927ء

(5) پانی پت کے مسلمان امتحان گاہ صبر میں۔ (از ظفر علی خاں) 21 مئی 1927ء

(6) گالیاں اور تہمتیں۔ (از ظفر علی خاں)۔ 22 مئی 1927ء

(7) سلطنت آصفیہ کا خاتمہ (ظفر علی خاں)۔ 29 مئی 1927ء

(8) عید الاضحیٰ اور سنت خلیل اللہ اسلام۔ 11 جون 1927ء

(9) سرمائیکل اڈوائر کا تازہ کلام (از ظفر علی خاں۔ 19 جون 1921ء

(10) سر میلکم ہیلی سنگھیٹیوں کے نرغہ میں ۔ 13 جولائی 1921ء

(11) مولانا شوکت علی اور مجلس خلافت پنجاب ۔ 27 اگست 1921ء

(12) مسودہ قانون تعزیر مذاہب از ظفر علی خاں ۔ 28 اگست 1921ء

(13) زمیندار عید میلاد نمبر حجت حق کا ظہور ۔ 10 ستمبر 1921ء

(14) دارالعلوم دیوبند کے قضیے کا خاتمہ ۔ 25 ستمبر 1921ء

(15) مسئلہ افیون ۔ 9 اکتوبر 1921ء

(16) لالہ لاجپت رائے اپنے اصلی رنگ میں ۔ 30 اکتوبر 1921ء

(17) فتنۂ تفریح اداریہ ۔ از ظفر علی خاں ۔ 20 نومبر 1921ء

(18) ہندوستان اور پارلیمنٹ انگلستان ۔ 2 دسمبر 1921ء

(19) سائمن کمیشن کا مقابلہ ۔ 4 دسمبر 1921ء

مارچ 1921ء میں جب سالک اور مہر اخبار "زمیندار" سے الگ ہوئے تو مولانا ظفر علی خاں پر تمام ذمہ داریاں آ گئیں ۔ جلسوں کے علاوہ اخبار کی براہ راست نگرانی کرنی پڑی ۔ اس پریشانی کی وجہ سے نہ تو بہت ہاری اور نہ ہی گھبرائے اور بہت ہی اطمینان سے بخوبی اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے رہے ۔ "زمیندار" کا پہلا صفحہ 1921ء میں اس طرح سے ہوتا تھا ۔

پہلے صفحہ پر عام طور پر کوئی مضمون ہوتا تھا ۔ کبھی کبھی مولانا ظفر علی خاں کی نظم شامل ہوتی تھی ۔ یہ خصوصیت ہفتہ وار ایڈیشن ۔ جو کہ اتوار کے دن نکلتا تھا) رہی ۔ مولانا ظفر علی خاں کی جو نظمیں ہوتی تھیں وہ پہلے

صفحہ پر شائع ہوتی تھیں۔ اسی کی وجہ سے بھی اخبار نے بہت ہی نمایاں اہمیت حاصل کر لی تھی۔ اس کی مثالیں مندرجہ ذیل پیش کرتے ہیں۔

(1) کیا بدی اور کیا بدی کا شوربا۔ 23 جنوری 1927ء

یہ شدھی کیا اور اس کی کیا حقیقت — یہ بدی کیا اور اس کا شوربا کیا

جنھیں دیگنہ پہ سورج کا گماں ہو — ان اوندھی عقل والوں سے گلا کیا

بُروں کی جان کو رویا اگر میں — تو بتلاؤ بُرا میں نے کیا کیا۔

(2) سرکار دو عالمؐ سے التجا۔ 6 فروری 1927ء

نجد تیرا ہے، مصر تیرا ہے، روم تیرا ہے، شام تیرا — ہند میں لیکن کفر پہ غالب آ نہ سکا اسلام تیرا

خوفِ خدا تو اٹھ چکا تھا، شرم نبی کی بھی نہ رہی — مسلم ہندی دیدہ وروں نے دیکھ لیا انجام تیرا

(3) نوائے درد۔ 17 اپریل 1927ء

ناداں ہیں جو کرتے ہیں بھروسہ دفقاء پر — تکیہ وہی اچھا ہے جو ہو اپنے خدا پر

راضی ہو ہر اک حال میں مولا کی رضا پہ — دیکھ اپنی نظر شیوۂ شاہِ دو سرا پر

ہے کوئی جو ملجے کو تھامے ہوئے نکلے — اسلام کے آفت زدہ بچوں کی صدا پر

(4) کہاوتیں۔ 29 مئی 1927ء

اپنے لیڈر پر اور اس کی لیڈری پر تین حرف — جو ہر ایک تجویز پہ جا کو بجا کہنے لگے

جب سے سید ابی کو اپنانے لگے حکمت ای — ڈاکٹر موسیٰ انھیں اپنا چچا کہنے لگے

(5) حریفوں سے دو دو باتیں۔ 11 جون 1927ء

جن سے مقابلہ ہے وہ ہیں نام کے حریف — میدان میں اب تک آ نہ سکے کام کے حریف

کو نقوں پہ جو دھوکے پیک لیں انٹیں تو کیا ہوا — جب ہے مزا کہ رن میں ہوں صمصام کے حریف

(6) اسماء الرجال ۔ ڈاکٹر محمد عالم ۔ 28 اگست 1927ء

ادھر ہیں ڈاکٹر مونجے ادھر ہیں ڈاکٹر عالم ادھر گدھ برادر ادھر عنبر ادھر گنگا ادھر زمزم

یہاں حق کی علمداری وہاں باطل کی سالاری یہاں طوفان وہاں تنکا یہاں سورج وہاں شبنم

(7) نغمۂ جشن میلاد ۔ 10 ستمبر 1927ء

ہو گئی اس پر فقط رسالت دینے گئے ہیں جبکی شہادت قدسی عمران عیسیٰ مریم صلی اللہ علیہ وسلم

عرش بریں سے فرش زمیں تک، فرش زمیں سے عرش بریں تک غلغلہ برپا ہے یہی پیہم صلی اللہ علیہ وسلم

(8) بادۂ کہن ۔ 9 اکتوبر 1927ء

اتنی ہی آرزو ہے مرے دل میں اے خدا اسلام کو زمانہ میں دیکھوں میں سربلند

دنیا میں سرنگوں علم مصطفیٰ نہ ہو ہم خود ذلیل ہوں اور خدا ارجمند

(9) رازہائے سربستہ 20 نومبر 1927ء

پوچھ لیتا ہے فرنگی رہبائی کا راز ایشیا میں ہے بہ اس کی کارفرمائی کا راز

نشۂ توحید میں سرشار ہے ابن سعود ہے فقط اتنا ہی اس کی شان دانائی کا راز

(10) پیام وقت ۔ 4 دسمبر 1927ء

بوکرنی ہے جہانگیری محمدؐ کی غلامی کر عرب کا تاج سر پر رکھ خداوند عجم ہو جا

کرانا ہے قلم ہاتھوں کو رودادِ جنوں لکھ کر تو اس دورِ ستم پرور میں میرا ہم قلم ہو جا!

ان نظموں کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں نے بہت سی نظمیں لکھیں۔ ان جاندار نظموں، صحافی معرکوں اور پرجوش و معنی خیز اشعار کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف عوام پر ان کی دینی اپیل اور جذبات کی پبت بیٹھ گئی۔ بلکہ ان کے اشعار کی مٹھاس نے لوگوں میں جوش پیدا کر دیا۔ اس خصوصیت سے

"زمیندار" ہر طرف پھیل گیا۔ اس کی وجہ سے اس اخبار کی اشاعت بہت زیادہ ہو گئی۔ جب یہ نظمیں چھپنے لگی تو دوسرے حضرات بھی اپنی شاعری کو شائع کرانے کے لئے مولانا ظفر علی خاں کے پاس بھیجنے لگے۔ اور یہ نظمیں سنڈے ایڈیشن میں شائع ہونے لگیں۔

زمیندار اخبار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ "افکار و حوادث" کے نام سے روزمرہ واقعات پر ایک دلچسپ تبصرہ ہوتا تھا۔ مارچ 1927ء تک یہ افکار و حوادث سالک کے قلم سے نکلتے تھے۔ اور ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں اور ادبی چٹکلوں نے زمیندار کو اور بھی پر لطف بنا دیا تھا۔ جیسے۔

"ایک دسویں صدی کا غزنوی تھا۔ جس کی یلغاروں کی یاد سے آج تک بھارت برس لرزہ اندام ہے۔ جس کی چمکتی ہوئی تلوار کی نوک نے سوم ناتھ کے بتوں کی گردن کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس کے آقا و مولا کے عصائے قدس نے بیت الحرام کے کثیر الانفاد اصنام کے ساتھ کیا۔ ایک اس بیسویں صدی کے غزنوی ہیں۔ جن کی ہمت اسلامی کا یہ عالم ہے کہ اس ملک کی ہر جنبش پر جس سے بت کدہ کا قفل کھلتا ہے۔ بے تابانہ رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ نام کو دونوں غزنوی ہیں۔ مگر ایک کا کام غزنوی تھا۔ دوسرا نام کا غزنوی ہے۔ روزگار سفلہ پرور سے کس لشمے نہ دیکھے تھے۔ تو اب کلکتہ میں جا کر دیکھ لو"[1]

1۔ زمیندار - 2 فروری 1927ء

اردو صحافت میں 1928ء کا سال اس لحاظ سے ایک افسوس ناک سال تھا کہ افکار و حوادث کی سبب سالک نے زمیندار کے خلاف جو ادبی چٹکیاں لیں وہ کسی نہ کسی حد تک آگے بڑھ کر ذاتیات تک پہنچ گئیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک مضمون میں مولانا ظفر علی خاں کی علمی ادبی اور صحافتی اور انتھک محنت کا انکار کرتے ہوئے ایک جگہ یہ بھی لکھ دیا کہ "بیج ناقص ہے یا زمین شورزار ہے" اس وجہ سے یہ صحافتی لڑائی زیادہ بڑھ گئی اور ظفر علی خاں کو اس سلسلے میں کئی نظمیں بھی لکھنی پڑیں۔ اور اپنی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے نظموں میں معرکتہ الآرا جواب دیئے۔

زمیندار 1928ء میں جو اداریے لکھے گئے وہ اس طرح سے تھے۔

(1) آل انڈیا کانگریس میں مفاہمت۔ یکم جنوری 1928ء

(2) رائلن کمیٹی کا فیصلہ۔ 15 جنوری 1928ء

(3) غازی امان اللہ خاں سے ہندوستان کی اپیل۔ 23 جنوری 1928ء
از ظفر علی خاں

(4) غازی امان اللہ خاں کی کج کلاہی کا نیا دور۔ 30 جنوری 1928ء
از ظفر علی خاں

(5) نوجوانانِ وطن سے خطاب۔ 2 فروری 1928ء

(6) سر محمد شفیع کا نیا مشغلہ۔ 24 فروری 1928ء

(7) سر میلکم ہیلی کی تازہ ترین ارشادات۔ 3 مارچ 1928ء

(8) ہلالِ احمدیہ کی دو باتیں۔ ظفر علی خاں کے تاثرات۔ 23 مارچ 1928ء

(9) سائمن کا مشن اور ہمارا فرض ۔ 29 مارچ 1928ء

(10) مذہب کے خلاف جنگ ۔ 24 اپریل 1928ء

(11) ڈاکٹر عبدالعلیم قریشی اور مولانا غلام رسول مہر ۔ از ظفر علی خاں 29 اپریل 1928ء

(12) لبیک اللّٰہم لبیک لاشریک لک لبیک ۔ از مولانا ظفر علی خاں 6 مئی 1928ء

(13) یادگارِ حسین ۔ 29 جون 1928ء

(14) سر شادی لال اور مسلم آؤٹ لک ۔ 21 جولائی 1928ء

(15) آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ ۔ 26 اگست 1928ء

(16) سرکار دو عالمؐ کی شانِ رحمت اللعالمین ۔ 29 اگست 1928ء

(17) اقلیتوں کے حقوق ۔ 9 ستمبر 1928ء

(18) سر جان سائمن کا اعترافِ شکست ۔ 21 ستمبر 1928ء

(19) سائمن کمیشن کو اپنے فرض کا احساس 18 اکتوبر 1928ء

(20) نظام الملک آصف جاہ ہفتم مغربی استعمار کی چیرہ دستیوں کا حریفِ اعظم ۔ از مولانا ظفر علی خاں 6 نومبر 1928ء

(21) شملے میں سرکاری پیلوں کا ناچ ۔ 20 نومبر 1928ء

(22) پنجاب کونسل میں جدید گورنر کی تقریر ۔ 2 دسمبر 1928ء

مولانا ظفر علی خاں نے جو اداریے لکھے ان میں سے دو اداریے آپ کے سامنے پیش ہیں ۔ کیونکہ یہ دونوں اداریے ان کے دلی جذبات اور تاثرات کے

ساتھ ان کے پروقار اور سنجیدہ انداز تحریر میں ادبیت کو پوری طرح سے اپنے اندر جذب کرتے ہوئے ہیں۔ جس سے ان کے روزِ بیان کا اندازہ اچھی طرح سے ہو سکتا ہے۔ ان کے اداریے زمینداری کا کام کرنے والے اور عملہ ادارت کے لئے ایک بہترین نمونہ تھے۔ اس طرح سے ملک کے نوجوان افراد کو زمیندار نے صحافت کے اعلیٰ معیار سکھائے۔ اب ہم ان کے دو لوں اداریوں کو پیش کرتے ہیں۔

(۱) لبیک اللہم لبیک لا شریک لک لبیک ۶ مئی 1925ء

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کو کاٹے ہے

مژدہ خار دشتِ پر تلوا مرا کھجلائے ہے۔

خاک کعبہ کی وہی چار ہزار سال کی پرانی کشش جو آذر کے حقیقت شناس بیٹے کو کالڑہا کے چمنستانوں سے حجاز کی غیر ذی زراعت وادی میں کھینچ لائی۔ جس نے عبدالمطلب کے عالی مقام پوتے کی جاذبیت سے سرشار ہو کر بنی آدم کی ان گنت نسلوں کے ساتھ ہر سال وہی سلوک کیا جو مقناطیس لوہے کے ساتھ کرتا ہے۔ آج مجھ ذرہ بے مقدار کو بھی بے تاب کر دیا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے پندار کے صنم کدہ کو ویران چھوڑ کر دیوانہ وار قرب و صدق اور اخوت و مساوات کی اس آزاد بیاد دیوار کی طرف دوڑ پڑوں جس کے ساتھ تیرہ صدیوں سے ملت بیضا کی مرکزیت قائم ہے۔

وفد خلافت کا رئیس ہو کر جب سلطان ابن سعود سے گفتگو کرنے کے لئے آج سے تین سال قبل میں عازم حجاز ہوا تو صرف فریضۂ عمرہ

کی بجا آوری کی سعادت نصیب ہو سکی اور حج کی حسرت دل ہی میں باقی رہ گئی۔

پھر حج کے موقع پر مولانا شوکت علی اپنے احباب کے ساتھ موتمر عام میں شریک ہونے کی غرض سے تشریف لے گئے اور مجھے اپنا عزم زیارت حرمین اس خیال سے ملتوی کرنا پڑا کہ مبادا حجاز میں میری موجودگی ان شبہات کے لئے وجہ تقویت بن جائے جن کا راز ان حضرات نے اپنی رپورٹ میں اپنی واپسی پر بے اختیار فاش کر دیا۔ اس دفعہ کوئی حقیقی یا وہمی مصلحت مجھے وہ فرض ادا کرنے سے روک نہیں سکتی۔ جس پر میری اسلامی زندگی کے پانچویں حصہ کا کامیابی کے ساتھ تمام ہونا منحصر ہے۔

اللہ کا نام لے کر میں وہ گزار ارض مقدس ہوتا ہوں۔ تاکہ اپنی فطرت کو اس چشمہ میں غوطہ دے سکوں۔ جو ابھی تک اپنی اولین صفائی کے ساتھ ابل رہا ہے۔ اور مغربی آرائشوں سے مکدر نہیں ہوا۔ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا عازم ہوں۔ جہاں ابھی تک اسلام کا قانون نافذ ہے۔ جہاں ابھی تک شریعت مطہرہ کا آئین جاری ہے۔ جہاں کا ضابطہ دیوانی کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ ہے۔ جہاں کا فرمان روا توحید کا ذوق الصدق ابن مسعود ہے۔ خدا اسے دیر تک زندہ رکھے۔ کیونکہ تنزیح کے اس دور پر فتن میں ناموس شریعت کے تحفظ کی امید آج اسی کے دم سے زندہ ہے۔

بیت اللہ پہنچ کر حضور خواجہ دوجہاں کے آستانہ پر باریاب ہو کر میں تو ان کے لئے دعائیں مانگوں گا ہی۔ لیکن مجھے امید ہے کہ مسلمان اپنی پنج وقتہ دعاؤں میں مجھے فراموش نہ کریں گے۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ (از ظفر علی خاں)

(2) نظام الملک آصف جاہ ہفتم۔ مغربی استعمار کی چیرہ دستیوں کا حریف اعظم۔ 18 نومبر 1920ء

یہ کہہ دیں ہے پلٹ کر نگاہِ یار الٰہی
زمانہ اور بھی ہوسے گا ایک بار الٰہی

خودداری ہندوستان کو حریفانِ فرنگ سے اپنا ناموس بچانے کے لئے آج جس جگہ گسل آویزش کا سامنا ہے۔ اس کی تاریخ سپرد قلم کرتے وقت مستقبل قریب کا بالغ نظر ثاقب نگاہ اس حقیقت کا خواہی نخواہی اعتراف کرے گا کہ برطانیہ کے بے پناہ استعماری حربوں کے مقابلے میں برادر اعظم ہند کے ایک ثلث یعنی گیارہ کروڑ انسانوں کی طرف سے جو طاقت پوری توانائی کے ساتھ اوّل اوّل سینہ سپر ہوئی۔ وہ مسلمان کی جلیل المنزلت تاجدار کی ذاتِ گرامی تھی۔ کانگریس اور خلافت نے بے شک برطانوی ہند کی کامل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دے کر انگریزی اقتدار کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ لیکن دیسی ریاستوں کو جو برطانیہ کے ستم ہائے بے حساب کا بازیچہ بنی ہوئی ہیں۔ اس وقت بھی کسی نے اپنی ڈال پر چھوڑ دیا۔ جب انگریزوں کی حکمرانی

گرفت برطانوی ہند پر ڈھیلی پڑ جائے گی۔ اور پھر وہ ہندوستانی حکومت جو انگریزی اقتدار کے کھنڈروں پر قائم ہوگی۔ ان ریاستوں کے ساتھ اپنے حلیفانہ سیاسی تعلقات کی طرح ڈال سکے گی۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ وقت کب آئے گا۔ لیکن اگر اس کے انتظار میں والیانِ ریاست ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تو ڈلہوزی کی وہ حکمتِ عملی جسے کرزن نے حیاتِ تازہ بخش کر ریڈنگ کے زمانے میں منتہائے اشتداد پر پہنچا دیا۔ ان سب کو صفحۂ روزگار سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتی اور ان کا ٹھکانا یا تو جلاوطنوں میں ہوتا یا پھر برطانوی ریذیڈنسی کے پیراسیوں میں۔

شرف و مجد ہند کی اس انتہائی تذلیل کا اولین احساس اس شخص کو ہوا جس کی رگوں میں قلیچ خاں کا گرم خون ابھی تک اپنی پوری حرارت کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ میر عثمان علی خاں کی فاروقی حمیت کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ ان حدودِ سلطنت کے اندر جو رقبۂ فرانس سے سمجھ لیں۔ انگریز سیاہ و سپید کے مالک ہوں۔ اور ان کے ہم چشموں میں سے جس کو چاہیں گدی سے اتار دیں۔ جس کو چاہیں جلاوطن کر دیں۔ جس پر چاہیں مقدمہ چلا دیں۔ مادرِ ہند کا یہ مایۂ ناز سپوت یہ جانتے ہوئے کہ اس کا مقابلہ دنیا کی سب سے مہیب عسکری طاقت سے ہے۔ اپنے آبائی حقوق کی طاقت کے لئے دیوارِ آہن بن کر کھڑا ہو گیا اور حکومتِ انگریزی کو ذیل کا الٹی میٹم بھیج دیا۔

(۱) برار جو دولتِ آصفیہ کا جزو لاینفک ہے۔ واپس کر دیا جائے۔

(۲) دولتِ آصفیہ اپنے اندرونی معاملات میں بالکل اسی طرح خود مختار ہوگی جس طرح ہند ہے۔ اس یادگار زمانہ تحدی نے برطانوی امپریلزم کے ساتھ وہی سلوک کیا جو بھڑکتی ہوئی آگ پر دکھے ہوئے توے کی سرخی دانۂ اسپند کے ساتھ کرتی ہے۔ میر عثمان علی خاں کا ایک بھی مطالبہ ایسا نہ تھا جو حق و انصاف پر مبنی نہ ہو اور جس کا ادا وہ مقدس عہد نامے نہ ہو جو اسٹیٹ انڈیا کمپنی اور اس کے بعد تاجدار برطانیہ نے فرمان روایانِ دکن کے ساتھ وقتاً فوقتاً کیے۔

اس یہودی نے جس کا نام لارڈ ویڈنگ ہے۔ بادشاہوں کا مورچہ سر کرنے کا مفرورانہ فیصلہ کر لیا کہ تاجدارِ دکن کو اس "تمرد" کا مزہ چکھایا جائے گا اور اسے بتایا جائے گا کہ دولتِ برطانیہ اپنے "تاریخی حلیف" کی حیثیت ہندوستان کے ایک معمولی رئیس سے برتر کر نہیں سمجھتی ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت بخوف اس اسرائیلی پتلے نے جو مکتوب مسلۂ دکن پر شائع کیا۔ وہ اپنی دنیا تک برطانیہ کی ہندوستانی حکمتِ عملی کے ماتھے پر ڈالنک کا ٹیکہ بن کر چمکتا رہے گا۔ اس مکتوب نے آخری بار اس قبیح حقیقت کا اعلان ڈنکے کی چوٹ کر دیا۔ کہ برطانیہ کی لغت میں احسان پذیری، حق شناسی اور انصاف پسندی وہ الفاظ ہیں جن کے کوئی معنی نہیں۔

دوسرے والیان ملک نے یہ دیکھا کہ مغرب کا استعماری بگولا ان کے جمی دولت و اقبال کو اڑائے لئے جا رہا ہے۔ سر جوڈ کر مشورہ کیا کہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے برطانیہ سے ناجائز التجائیں کریں۔ لندن تک اپنے وفد لے جائیں اور ہٹلر کمیٹی کے روبرو اپنی فریاد پیش کریں۔ لیکن میر عثمان علی خاں کی غیرت نے اس کو اپنی شان کج کلاہی کے منافی سمجھا اور برکنی بندوقوں اور بٹلروں سے کسی قسم کا کوئی سروکار نہ رکھا۔ حضور اب دہلی تشریف لاتے ہیں۔ اور آپ کا مقصد صرف چند روزہ سیاحت ہے۔ غالباً لارڈ اروِن آپ سے ملیں گے اور یقیناً مسائل دکن پر بھی آپ سے تبادلہ خیالات کریں گے۔ لیکن آپ کے خیالات کو دنیا جانتی ہے کہ جب تک دم میں دم ہے ہم نہ چھوڑیں گے خواہ کچھ کیوں نہ ہو جائے۔

1929ء میں زمیندار کے اداریے اس طرح سے تھے

(1) غازی امان اللہ خاں کی کج کلاہی کا نیا دور۔ 20 جنوری 1929ء

(2) غازی امان اللہ خاں سے ہندوستان کی امیدیں۔ (از ظفر علی خاں) 23 جنوری 1929ء

(3) سر محمد شفیع کا نیا مشغلہ۔ 24 فروری 1929ء

(4) جنرل نادر خاں کے دعاوی و عزائم۔ چند کھری کھری باتیں۔ (ظفر علی خاں) 17 مارچ 1929ء

(5) مسلمانان کشمیر اور مہاراجہ سر ہری سنگھ۔ 22 جون 1929ء

(6) یوم النبیؐ کی حقیقی شان۔ (ظفر علی خاں) 18 اگست 1929ء

(7) افغان ریلیف فنڈ۔ 20 اکتوبر 1929ء

(8) زمیندار اور جبرئیل نادر علی خاں۔ 10 نومبر 1929ء

(9) خالصہ کی نفرام (فرزندانِ اسلام کو دریائے خون میں شناوری کی دعوت) از ظفر علی خاں 19 ستمبر 1929ء

(10) مسلمانوں کے مطالبات۔ 3 نومبر 1929ء

1929ء کے زمیندار میں منظومات اس طرح سے ہیں۔

اوّل صفحہ پر سنڈے ایڈیشن میں سابقہ روایات کی طرح ظفر علی خاں کی تازہ نظمیں جو موجودہ سیاسی حالات یا کوئی اہم واقعات پر مبنی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ کہ اداری کا دکن حضرات کی نظمیں۔ جن میں مولانا فدا بخش اظہر امرتسری، قاضی احسان اللہ وزیر آبادی، محمد اسد خاں بی اے ملتانی، داز رام پوری، ان کے علاوہ خصوصیت سے اقبال کی بعض نظمیں بھی شائع ہوتی رہیں۔ ظفر علی خاں کی نظموں میں مندرجہ ذیل نظمیں قابل ذکر ہیں۔

(1) "نغمۂ نوحہ" 23 جنوری 1929ء

فدا کی شان اک سچے کا بچہ — مقابل ہے محمدؐ ذائیوں کے
نبی دکھلی پتے کی ہا تو اس نے — اذان اللہ کی شیدائیوں کے
حریف اس عہد میں ہیں اور سولہ — ہوئے اللہ کی یکتائیوں کے

(2) "نغمۂ نوحہ" 12 مارچ 1929ء

اگر جاگا جواں ایشیا خوابِ گراں سے ہے — چلا اک تیر اس شوخ۔ بانکی کماں سے ہے

اگر بعوثی ہیں تو رشید درخشاں سے نہ کم ہیں — اگر بعوثی یہ نور افشاں ہوائی آسمان سے ہے۔

مجھے ہنگامہ ہے غلو قرضی نواجہ یثرب — اور اس ہنگامہ کی رونق امان اللہ خاں سے ہے

(۳) "فریاد بحضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم" 22 رجون 1929ء

اے خاور حجاز کے درخشندہ آفتاب — صبح ازل ہے تیری تجلی سے فیض یاب

ذینت ازل کی ہے تو ہے رونق ابد کی تو — دونوں میں جلوہ ریز ہے تیرا ہی رنگ و آب

شایاں ہے تجھ کو سرور کونین کا لقب — نازاں ہے تجھ پہ رحمت دارین کا خطاب

حق سے یہ عرض کر کہ تیرے ناسزا غلام

بخشی میں سرخرو ہوں تو دنیا میں کامیاب

(۴) "ہیکل تفریح کے پرستار" 12 اکتوبر 1929ء

اس درجہ نفس ادنیٰ کی وہ تعظیم کریں گے — خود اپنی شریعت ہی میں ترمیم کریں گے

کہہ دیں گے جو ایجاد کہ اسلام ہے ناقص — بے چون و چرا اس کو وہ تسلیم کریں گے

دنیا کے مسئلہ پر اگر ہوگی بحث — قربان یہ وہاں دین کی تعلیم کریں گے

1929ء کے مضامین نگاروں میں حسب ذیل مضامین نگار اور ان کے مضامین قابل ذکر ہیں۔

"زمیندار اور وہابیت" از مولانا اللہ دتہ، احمد شاہ ابدالی کے کارنامے، جرنیل نادر شاہ اور دعوت لامرکزیت، از مولانا نور الحق، خطبۂ صدارت جمعیت اشاعت اسلام، آسام از مولانا سید غلام بھیک نیرنگ، رزم گاہ طرابلس میں عربی فصاحت کے جوہر از مولانا محمد قدیر ظفر ندوی، باشندگان ہند کی ذہنیت اور ہندوستان اور برطانیہ کے باہمی تعلقات۔ از ہندو

جواہر لال نہرو، اہل برہمن کو اصنام پرستی کی دعوت اور مسیحیت کا جنازہ تہذیب مغربیت کے کندھے پر، عنایت اللہ خاں کی سوانح حیات (از سول اینڈ ملٹری گزٹ) مصر میں برطانوی استعمار کے کرشمے۔ یہ وہ چند سیاسی، علمی اور ادبی مضامین میں سے کچھ عنوانات ہیں۔ جن سے ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض مضامین خود مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے بھی لکھے گئے۔ جن میں مولانا ظفر علی خاں کے اہم مضامین قابل ذکر ہیں۔

(1) خسرو پرویز کے عروج و زوال کی داستان۔

(2) عرب طبیعت کے فطری جوہر۔

ان کے علاوہ زمیندار میں خبریں اور ان پر تبصرہ بھی ہوتا تھا۔

1929ء میں افغانستان کے انقلاب، امان اللہ خاں کی تخت سے دست برداری اور بچہ سقہ کی بغاوت پر اور جنرل نادر خاں کی آمد پر خبریں زور و شور سے اور دو دو کالمی جلی قلم سے شائع ہوتی رہیں۔ اور مولانا ظفر علی خاں افغانستان ریلیف فنڈ کھول کر افغانوں کی مدد کا بیڑہ اٹھایا۔ مولانا نے اس وجہ سے افغانستان کے مسائل پر خصوصی اداریے بھی لکھے۔

19 ستمبر 1929ء کو مولانا ظفر علی خاں نے اپنے قلم سے ایک پر زور اداریہ "خالصہ جی کا نفیر عام اور خطرۂ زندان اسلام کو دریائے خون میں شناوری کی دعوت" کے عنوان سے لکھا۔ 6 اکتوبر 1929ء کو "مسلمانوں کا افتراق و تشتت" کے عنوان سے دو کالمی طویل اداریہ لکھا گیا۔ جس میں یہ بتایا گیا کہ مسلمانوں کی دونوں جماعتوں کو حقوق ملی کی حفاظت کے لیے اور استخلاص

وطن کے مقصد پر جمع ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ وہ قوتیں جو ایک دوسرے کے تخریب پر صرف ہو رہی ہیں۔ وہ تعمیر کے لئے کارآمد ہو سکیں۔ 3 نومبر 1929ء کو "مسلم آؤٹ لک" کے مقالہ افتتاحیہ میں کہا گیا کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس سوئی ہوئی ہے۔ زمیندار نے لکھا ہے کہ یہ کانفرنس ان سرفروشوں کی قیادت اور رفاقت کی محتاج ہے جو ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز ہو۔

1931ء میں "زمیندار" کے اداریے مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) "ذعما ملت کے گفت و شنید کا انقطاع اور مفاہمت 25 جون 1931ء کی توقعات کا افسوس ناک انجام"۔

(2) "مہاتما گاندھی کی فہرست الزامات کا جواب"۔ 27 اگست 1931ء

(3) "حکومت سے دو دو باتیں"۔ 15 نومبر 1931ء

ستمبر اور اکتوبر کا مہینہ مسلمانانِ پنجاب کے لئے ایک آزمائش کا زمانہ تھا ستمبر میں مغل پورہ کالج پر پکٹنگ ہوئی۔ مولانا احمد، مولانا داؤد غزنوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی گرفتاری پر احتجاج مستعفی طلبا اور ہجوم پر پولیس کی لاٹھیوں کی بارش، زمیندار نے اس سلسلے میں خصوصی نمبر شائع کئے۔ اس زمانے میں مولانا ظفر علی خاں لاہور سے باہر تھے۔ 12 ستمبر کو واپس آئے تھے۔ ان تمام واقعات پر مسلسل اسی طرح کے اداریے لکھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دفتر زمیندار پر صبح سے لے کر ڈیڑھ بجے دن تک پولیس کا قبضہ رہا۔ اور تین گھنٹے تک تلاشی لی جاتی رہی یہاں تک کہ سب انسپکٹر نے اس بات پر اصرار کیا کہ مولانا ظفر علی خاں کے زنانے مکان کی بھی تلاشی لی جائے۔

جس طرح یہ سال دہشتوں کا سال تھا اور زمیندار پر گرفتاری، تلاشی اور ضبطی ضمانت کے نادر شاہی وار ہوئے۔ زمیندار نے اپریل میں جو اداریے افغانستان اور امان اللہ خاں غازی کے متعلق لکھے تھے۔ اس وجہ سے ان پر یہ گرفتاری اور ضبطیٔ ضمانت کی سزا عمل میں آئی۔

1931ء میں تحریک کشمیر شروع ہو چکی تھی اور ہزاروں مسلمان گرفتار ہو چکے تھے۔ مجلس احرار کے رضا کاروں نے اس سلسلے میں بہت قربانیاں دی تھیں۔

1932ء میں زمیندار نے جو اداریے لکھے وہ اس طرح سے تھے۔

(1) "مسلمانانِ کشمیر پر یہ پے در پے مصائب کا ہجوم۔" 2 فروری 1932ء

(2) "وقت کا داغ" از مولانا ظفر علی خاں۔ 18 اگست 1932ء

(3) "درد کی دوا۔ ایس اللہ بکاف عبدہ"
مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے نکلا

(4) "ہندوستان" کے نام سے اداریہ نکلا۔

(5) "بڈھلاڈہ کا حادثہ اور مقامی حکام و حکومت پنجاب کی پراسرار خاموشی"

1933ء کے اداریے جو زمیندار میں نکلے وہ اس طرح سے تھے۔

(1) "دعوتِ عمل۔ فلاحِ دارین کی ایک ہی سبیل" 22 جنوری 1933ء
از مولانا ظفر علی خاں۔ اس اداریے میں نماز اور تجارت کے سلسلے میں لکھا۔

(2) قادیانی نمبر - 4 مارچ 1933ء

اس اداریہ میں مولانا ظفر علی نے خدا اور رسول کے نام پر مسلمانوں کو دعوتِ فکر دی ہے۔

(3) "مداخلت فی الدین" - 19 مارچ 1933ء

اس اداریہ کو ایک آیت کریمہ سے شروع کیا گیا تھا۔

(4) "پنجاب کا مفلس اور مقروض کسان" 23 جولائی 1933ء

(5) "پنڈت جواہر لال نہرو کا زاویہ نگاہ" 5 ستمبر 1933ء

1934ء کا سال "زمیندار" کے لئے امتحان کا سال تھا۔ کیونکہ اسی سال اخبار کی ضمانت بھی ضبط ہوئی۔ اور پریس بھی ضبط ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں "زمیندار" ایک "تبلیغی نمبر" نکالا۔ اسمبلی کے آئندہ انتخابات کے سلسلے میں مسلمانوں کو اپنا لائحہ عمل تجویز کرنے کے لئے غور و خوض کرنے کی "زمیندار" نے دعوت دی۔ اس وجہ سے "زمیندار" نے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو واضح طور پر پیش کیا۔

1934ء کے جو اہم اداریے لکھے ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

(1) شرح سود الفتا و حسابات کا قانون (ادارہ کی طرف سے) 26 جنوری 1934ء

(2) ساہوکاروں کو انقلاب پسندی کی تلقین - 15 اپریل 1934ء

(3) اسمبلی کے انتخابات آئندہ اور مسلمانوں کا مسلک - 13 اگست 1934ء

(4) ناموسِ رسول کی قسمت - 16 نومبر 1934ء

از ظفر علی خاں۔

(۵) پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ اور وفاقی نظام — 24 نومبر 1934ء

کا تابناک سراب (اداریہ)۔

(6) مجوزہ اصلاحات اور انگلستان کے لبرل (اداریہ) — 8 دسمبر 1934ء

(۷) غازی عبدالقیوم کی اپیل کا استرداد۔ — 24 دسمبر 1934ء

سزائے موت کی بحالی پر احتجاج۔

19 اکتوبر 1934ء کو ایک نظم "تقریر جرم عشق" کے عنوان سے [illegible] ہوئی۔ اس کی اشاعت کے بعد منصور اسٹیم پریس ضبط ہو گیا۔

1935ء کے جو پرچے "زمیندار" کے نکلے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) 6 جنوری 1935ء

(۲) یکم فروری 1935ء

(۳) 3 فروری 1935ء

(۴) 23 مارچ 1935ء

(۵) 10 اگست 1935ء

(6) 17 اگست 1935ء

1935ء کے چند اداریے قابل ذکر ہیں۔

(۱) سراب (اداریہ) [illegible] — یکم فروری 1935ء

(۲) قائد [illegible] کا کارنامہ — 10 اگست 1935ء

(۳) افغان بزبان آزاد — 17 اگست 1935ء

اسی سال دو بہت ہی اہم واقعات ہوئے۔ جون 1935ء میں کوئٹے کا زلزلہ۔ جس میں شہر مٹی اور اینٹوں کے ڈھیر میں بدل گیا۔ اور ہزاروں مکانات گر گئے۔ اس کے بعد جولائی 1935ء میں مسجد شہید گنج کا حادثہ پیش آیا۔ مجلس احرار نے مسئلہ شہید گنج میں مسلمانوں کے ساتھ شریک نہ ہونے کی وجہ سے مولانا ظفر علی خاں نے زبردست ناراضگی کا اظہار کیا۔ اور تمام مسلمانوں نے زمیندار کے اخبار کی تائید کی۔ اس وجہ سے جولائی 1935ء میں مولانا ظفر علی خاں کو نظر بند کر کے کراچی آباد بھیج دیا گیا۔ 1936ء میں رہا ہوئے۔ رہا ہونے کے بعد نومبر 1936ء میں لاہور میں شہید گنج کانفرنس ہوئی جس کے صدر مولانا شوکت علی تھے۔ اس کانفرنس میں یوپی سرحد بنگال اور برما کے نمائندوں نے حصہ لیا۔ مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا ظفر علی خاں کو بنایا۔ انھوں نے پورے آغاز سے کانفرنس کی غرض و غایت اور مسجد شہید گنج کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مسجد کے گرائے جانے کے واقعات اور مسلمانوں کے حصول مسجد کے لیے اضطراب اور آئینی طور پر مسلمانوں کی عدالتی کارروائی پر تفصیل روشنی ڈالی۔

1936ء کے بعد اخبار ملے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) 28 مئی 1936ء

(2) 3 جون 1936ء

(3) 14 جون 1936ء (مجاہد نمبر)

(4) 9 جولائی 1936ء

(5) 14 جولائی 1936ء

(6) 14 اگست 1936ء

(7) 14 اگست 1936ء

(8) 2 اکتوبر 1936ء

(9) 15 نومبر 1936ء

(10) 29 نومبر 1936ء

1936ء میں جو اداریے نکلے وہ یہ ہیں۔ جو کہ اس طرح سے ہیں۔

(1) "طلوعِ صبحِ سعادت" 28 مئی 1936ء

(2) جہاد و شہادت۔ مسلمانوں کی دو محبوب 14 جون 1936ء
آرزوئیں۔

(3) مسجد شہید گنج کی تحریک کا مفہوم۔ اتباعِ اسلام 9 جولائی 1936ء
خدمتِ خلق اور آزادیِ کامل۔

(4) اداریہ "سعادت کی افق سے زندگی کے آفتاب 14 جولائی 1936ء
کا طلوع" (سر فضل حسین مرحوم۔ ایک مہتمم بالشان زندگی کا خاتمہ)

(5) دلیر استعمار کی کارگزاری غداری کا انجام۔ 27 اکتوبر 1936ء

(6) شہید گنج کانفرنس بطرف آل انڈیا شہید گنج 10 نومبر 1936ء
کانفرنس لکھنؤ

(7) مصر و برطانیہ کا معاہدہ۔ قوموں کی آزادی 29 نومبر 1936ء
کی منزل۔

(7) مصر و برطانیہ کا معاہدہ۔ 29 نومبر 1936ء

قوموں کی آزادی کے عنصر۔

اس اخبار میں مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے "فکاہات" "چوئندہ یابندہ" کے نام سے شائع ہوئے جس کے چند شعر اس طرح سے ہیں ؎

سورج کو جس کے نور نے رخشندہ کر دیا موتی کو جس کے نور نے شرمندہ کر دیا
ہوتا ہے جن میں نام رسولِ خدا بلند ان محفلوں کا مجھ کو نمائندہ کر دیا
سردارِ دو جہاں کا بنا کر مجھے غلام میرا بھی نام تا بہ ابد زندہ کر دیا

مضمون کو گلہ ہے زمیندار سے تو ایک
ہر قسط کو حوالۂ آئندہ کر دیا

20 فروری 1937ء کو زمیندار کا "حج نمبر" جو 32 صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ علمی اور تاریخی اعتبار سے مختلف مضامین پر مشتمل تھا۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کے بعض پہلو اور کعبۃ اللہ کی مختصر تاریخ پر مضامین لکھے۔

فلسفہ حج، کلمیت اقوامِ اسلام کی تشکیل پر مشتمل تین کالمی اداریہ تھا۔ جس میں ارکانِ اسلام کے فوائد، روزہ اور نماز کی حکمتیں، حج کی برکات، عشقِ الٰہی کی دیوانگی پر لکھا گیا تھا۔ اس نمبر کا حصہ نظم خصوصی طور پر مولانا ظفر علی خاں کی نظموں پر مشتمل تھا۔ اس میں ان کی دو نظمیں مختلف عنوان کے ساتھ شائع ہوئیں۔

(۱) "مرد اریدکی بادشاہی"

کلام اللہ کو اس طرح کرتے نفے بنی آزر — کہ جو کچھ سن لیا روح الامیں نے پڑھ لیا فرفر

رسول اللہ کی امت کی رنگا رنگیاں دیکھو — کوئی ابیض کوئی اصفر کوئی اسود کوئی احمر

(۲) "عثمان علی خاں کا محبت اندوز نام"

ذکر آتا ہے جو عثمان علی خاں تیرا — نام لیتے ہیں محبت سے مسلماں تیرا

تیرے فرقہ میں لگے دیکھے ہیں میں نے پیوند — گرچہ جسم سے نہیں کم کچھ بھی ہے ساماں تیرا

فرم و دہر کو شامل ہیں نوازش تیری — سارے اقوام سے برتاؤ ہے یکساں تیرا

فکاہات کا حصہ بھی مولانا ظفر علی خاں کے اشعاروں سے پُر تھا۔ جس کے چند شعر اس طرح سے ہیں۔

اللہ دیتی ہے جب تقدیر کام آتی نہیں طاقت — نہ چل سکتی ہیں تدبیریں نہ چل سکتے ہیں حیلے

بداوت سے حضارت کو پڑا پالا تو دیکھیں گے — دھرے رہ جائیں گے تہذیب افرنگی کے پشتارے

اس نمبر میں دو مرثیے شوارہ میں اظہر امرتسری کی بحر طویل نظم سلام علی ابراہیم حاجی سرحدی اور مرزا بیضا خاں مروی ایرانی کی فارسی نظم اظہر حسین زاہدی کی نظم "سوز عشق" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس طرح سے یہ اخبار علمی و ادبی لحاظ سے ایک اہم نمبر ہے۔

16 فروری 1938ء سے اخبار پر مدیر مولانا ظفر علی لکھا ہوا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں پورے طور سے اخبار کی اداری ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے۔ اور اختر علی خاں (مولانا ظفر علی خاں کے بڑے بیٹے) بحیثیت پرنٹر اور پبلشر کے تھے۔

18 فروری 1938ء کو یوم مسجد شہید گنج بورے اہتمام سے منائے جانے کی اپیل۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ڈیلی گیٹوں اور ممبروں کے انتخاب سے متعلق محمد علی جناح صدر لیگ کا اہم بیان۔

اس اخبار کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں "نغمۂ فردوس" چودھری خوشی محمد ناظر کے کلام پر ریڈیائی تنقید کہ جس میں ان کے ناظم یا شاعر ہونے پر ادبی بحث۔ اسی طرح اردو کی ہستی کو مٹانے کے لئے یو۔پی۔ میں جو کوششیں جاری تھیں اس پر بھی خبروں کے ضمن میں تبصرہ۔

28 فروری 1939ء میں ہفتہ وار زمیندار کا ایک خصوصی نمبر نکلا۔ جو کہ محرم کی مناسبت پر شائع کیا گیا۔ اس نمبر کا اداریہ "اسوۂ حسین" کے نام سے مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے لکھا گیا۔ جس کا آغاز اور اختتام شعر ہی پر ہوا۔ ابتدا میں یہ شعر درج ہے ؎

نہ زیاد کا وہ ستم دہانہ یزید کی وہ جفا رہی
جو رہا تو نام حسین کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

آخر میں یہ شعر درج تھا ؎

حسین کا سر ہے آسماں پر جو وہ چکا تھا کبھی سناں پر
تو کم ہے سم سر کف تو ہو جا جو سر ہے کرنا بلند تجھ کو

6 جون 1939ء کو زمیندار کا سنڈے ایڈیشن نکلا۔ صفحہ اول پر "حیات جاوید" کے نام سے مولانا ظفر علی خاں کی ایک نظم

جس کے چند شعر اس طرح سے ہیں ؎

رحمتِ باری کم اپنا جوش کر سکتی نہیں یہ بڑی ندی قیامت تک اتر سکتی نہیں
کفر سے مجھ کو ہے لاگ اور دین سے مجھ کو لگاؤ کوئی اور الزام دنیا مجھ پر دھر سکتی نہیں
میں حرم سے اڑ کے بیٹھوں گا شاخِ لبدہ پر میرے پر تثلیث کی قینچی کتر سکتی نہیں

اس ایڈیشن میں دو کالمی اداریہ لکھنؤ کی شیعہ سنی منافقت کے سلسلے میں لکھے گئے۔ جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف سے ایک کانفرنس کے انعقاد کی تجویز کی تائید کی گئی۔

حصۂ نظم میں علامہ دشتی کے قلم سے ایک نظم اور اختر حسین نظیر لدھیانوی کے قلم سے ایک نظم۔ اسی طرح حصۂ مضامین میں مولانا ظفر علی خاں پر ایک چھ کالمی مضمون محمد شریف چشتی کے قلم سے اور اسید اظہر حسین زاہدی کا ایک افسانہ قابل ذکر ہے۔

25 جنوری 1947ء میں ان کا ایک اہم بیان جو اپیل کی شکل میں شائع ہوا۔ اس میں مولانا ظفر علی نے کہا۔

"لاہور میں صبر آزما صورتِ حال دونما ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی پنجاب کو نئی زندگی کے دروازہ پر لا کھڑا کیا گیا ہے۔ حکومت پنجاب کی تشدد فرمائیاں صبر و شکیب کی قوتیں مغلوب کرنا چاہتی ہیں۔ تاکہ فرزندانِ توحید کے صبر و ضبط کا بھرا ہوا پیمانہ چھلکنے لگے۔ اور وہ اضطراب و ہیجان سے بد نظمی اور افراتفری میں مبتلا ہو جائیں۔ فرد کا وہی کام نتیجہ خیز ہوتا ہے۔

جس کا رشتہ جماعت کے ہاتھ میں ہو۔ لہذا مسلمانانِ پنجاب تائید غیبی حاصل کرنے کے لئے کسی صبر آزما حرکت سے متاثر نہ ہوں اور اسی راہ پر چلیں جس پر مسلم لیگ چلنے کی ہدایت کرے۔ مسلمانوں کو ثابت کرنا ہے کہ ہم ہندو، سکھ اور اچھوت اور عیسائیوں کے محافظ ہیں۔ اور ان کی دوستی کسی قیمت پر نہیں بیچ سکتے ہیں اپیل کرتا ہوں کہ یہ اپیل مقبولیت کے کانوں سے سنی جائے گی۔

مولانا ظفر علی خاں

یہ بات صحیح ہے کہ زمیندار کے مدیر کا نام مختلف اوقات میں بدلتا رہا۔ اور خود زمیندار کو ایسے صاحبِ قلم صحافی اور ادیب ملتے رہے جنہوں نے مولانا ظفر علی خاں کے نقطۂ نظر کو پوری ذمہ داری کے ساتھ زمیندار کے صفحات پر پیش کیا۔ ان ممتاز لوگوں میں مولانا غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، مولانا خدا بخش اظہر، سید اظہر حسین زاہدی، قاضی احسان اللہ اور شروع کے دور میں مولانا عبداللہ عمادی، وجاہت حسین جھنجھانوی شامل ہیں۔ درمیانی دور میں مولانا مرتضیٰ احمد میکش، چراغ حسن حسرت، اشرف عطا قابل ذکر ہیں۔

یہ بات قطعی طور سے کہی جا سکتی ہے کہ مولانا ظفر علی خاں نے ہمیشہ اس اخبار کے لئے اپنی براہ راست نگرانی سے کام لیا۔ کیونکہ ان کے لئے تمام اداریوں کو پڑھنا اور ان کو درست کرنا اور اخبار کے معیار کو برقرار رکھنا سب سے اہم کام تھا۔ اس سلسلے میں مولانا ظفر علی خاں نے

اپنے بعض عزیزوں کی لاپرواہی تک کو برداشت نہیں کیا۔ راجہ مہدی علی خاں کو اس قسم کی غلطی کی وجہ سے اخبار کو چھوڑنا پڑا۔ اسی طرح مدیر اداریہ بھی پوری طرح ان کی نگرانی میں تھے۔ اس لئے یہ کسی بھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا کہ اخبار سے انہیں عملاً کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس وجہ سے ان کے اہم مضامین اور نظموں کا انتخاب کیا۔ اور ان کے اداریوں کو خصوصیت سے شامل کیا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کی صحافت نے ہنگامی اقدار کو بھی کبھی نہیں اپنایا بلکہ تہذیب، نو کے ہنگامی جلوؤں سے متنفر ہی رہے۔ انھوں نے کہا ہے ؎

تہذیب، نو کے منہ پہ وہ تھپڑ رسید کر
جو اس مرامزادی کا حلیہ بگاڑ دے

اگر ادب اجتماعی اور ازلی اقدار کی پیش کش کا نام ہے تو ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا ظفر علی خاں کا صحافتی ادب جس میں نظم و نثر دونوں کی حیثیت آج بھی باقی ہے۔ ان کے یہاں تخیل کا ملکہ موضوع کے اعتبار سے یقیناً کارآمد ہے۔ ان کا صحافتی ادب ایک فنی تخلیق ہے۔ جس میں تخیل سے کام لیا گیا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی صحافت ہی خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں تخلیق کے چراغ جلتے چلے جاتے ہیں۔ اور چراغوں کی روشنی دوسروں کو دعوتِ فکر بھی دیتی ہے۔ اور دعوتِ عمل بھی ؎

جن کے دل پتھر کے ہیں ان پر تو کیا ہوگا اثر
میرے دل کی بے صدا ہے دردمندوں کے لئے

یا تو خود مٹ جائیں یا باطل کی بنیادیں ہلا دیں
ایک ہی رستہ کھلا ہے حق پسندوں کے لئے

بحیثیت سیاسی رہنما

اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ایک فنکار کو سیاست کی پُرخار راہوں پر لانے والوں میں نمایاں نام :-

1. مولوی سراج الدین احمد
2. سرسید احمد خاں
3. علامہ شبلی
4. نواب محسن الملک
5. مولوی عزیز مرزا اور
6. سید جمال الدین افغانی۔

ان حضرات کا مولانا ظفر علی خاں کی سیاسی زندگی پر بہت ہی گہرا اثر ہوا اور ذہنی پختگی پیدا ہوئی۔ ان ہی لوگوں کی وجہ سے سیاسی زندگی میں بہت دور تک نکل گئے تھے۔ اس طرح سے انھوں نے اپنے قلم سے نیزہ کا کام لیا۔ اپنی اس فکر کو نظم و نثر کے قالب میں ڈھالتے رہے اور بہت ہی بلند حوصلہ کے ساتھ دشمن کے سامنے سے نہیں ہٹے۔ انھوں نے سب سے پہلے انگریزوں کی مکاری کے سبب ان سے نفرت کا سبق اپنے والد مولوی سراج الدین احمد سے سیکھا کیونکہ مولوی سراج الدین احمد انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کو یہ جذبہ اپنے والد سے وراثت میں

ملا کہ انگریزوں کا دباؤ کسی طرح سے قبول نہ کیا جائے۔

ان کے والد کشمیر میں جب ملازم تھے اس وقت بیگار کی رسم ختم کرانے میں حصّہ لیا۔ مولوی سراج الدین احمد بھی بھی "تہذیب الاخلاق" میں مضامین بھی لکھتے تھے۔ بقول جذبی صاحب۔

"تہذیب الاخلاق" نے تعصب، تقلید اور بیہودہ رسم و رواج کو ڈھیلا کیا اور سرسید کو اس سلسلہ میں اپنے بعض دوستوں سے بھی مدد ملتی جن کے مضامین تہذیب الاخلاق کی تائید میں نکلتے تھے"[1]

اس طرح ان کے والد کی دلچسپی کا اثر ان کی صلاحیتوں پر ہوا اور اپنے والد کی نگرانی نے ان کو ایک نیا حوصلہ دیا اور تعلیم کے دوران کئی نئے مقامات پر رہنے کی وجہ سے اجنبی ماحول میں رہنے کا ڈھنگ سیکھا۔ اس طرح سے دوسروں کے اچھے طور و طریقہ سیکھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔

سرسید احمد خاں کا بھی مولانا ظفر علی خاں کی سیاسی زندگی بنانے میں اور علی گڑھ کالج کے ماحول نے زبردست کام کیا۔ بقول ڈاکٹر عبدالحق۔

"سیاسی زندگی کا سنگ بنیاد اسی وقت رکھا گیا تھا جب انھوں نے سرسید کو دیکھا۔ علی گڑھ کے ماحول میں زندگی گزارنے کے سلسلے میں خاص بات یہ تھی کہ وہاں جو قومیت کی جھلک تھی۔ وہ کسی دوسری جگہ نہیں پائی جاتی تھی۔ یہ محض کالج کے

---

1 معین احسن جذبی۔ حالی کا سیاسی شعور۔ ص۔ 54۔ طبع انجمن ترقی اردو۔ علی گڑھ۔ 1959۔

بانی سرسید ہی کا طفیل تھا کہ انھوں نے مسلمانوں میں قومیت کا احساس پیدا کیا اور اس احساس کو ان اکابر قوم سے تقویت ملی تھی جو کسی نہ کسی تقریب میں یا سرسید کے پاس آتے تھے۔ سرسید کی صحبت نے ان میں وسعت نظر بھی پیدا کی۔ اس لئے سرسید کے زمانے میں علی گڑھ مسلمانوں کی قومی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا "[1]

اس طرح سے سرسید احمد خاں کا اثر مولانا ظفر علی خاں پر پڑا۔ اس وجہ سے ایک نئی روح ان کی سیاسی زندگی میں پیدا ہوئی۔

علامہ شبلی کی شاگردی نے مشرق سے محبت، اسلامی تاریخ کے مطالعہ کا شوق، نماز کی لگن اور عالم اسلام سے محبت کرنا سکھائی۔ بقول سید سلیمان ندوی۔

" شبلی اپنا ایک الگ سیاسی مزاج رکھتے تھے۔ استاد شاگرد دونوں راجپوت تھے۔ یہ راجپوتی رنگ اسلام کی بھٹی میں نکھرا۔ اور خدمت اسلام کے پرخلوص جذبے نے دونوں کو عمل کے میدان میں لا کھڑا کیا "[2]

ان کی شاگردی نے مولانا ظفر علی خاں میں ادبی و علمی ذوق پیدا کیا۔ اس کے علاوہ اسلامی تاریخ کا شوق براہ راست علامہ شبلی سے سیکھ کر یہ بھی معلوم کیا کہ اسلامی آثار کو بچانے کے لئے ماحول سے ہٹ کر کس

---

1 ڈاکٹر عبدالحق۔ نقوش "آپ بیتی نمبر" ص۔ 35۔ طبع 1964ء لاہور۔

2 سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی۔

طرح کام کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے وہ جب بھی کہیں کوئی غلط ماحول دیکھتے تو اس کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ یہ دین ان میں شبلی نے پیدا کی تھی۔

نواب محسن الملک کے پاس مولانا ظفر علی خاں بی۔ اے کرنے کے بعد بمبئی گئے تھے۔ وہاں وہ ایک سال ان کی خدمت میں رہے اور اس کے بعد ان کے کہنے پر حیدرآباد چلے گئے تھے۔ نواب محسن الملک بہت ہی دور اندیش انسان تھے۔ اس وجہ سے مولانا ظفر علی خاں نے بھی یہ مانا ہے کہ ان کی علمی کاوشوں اور عالم اسلام سے محبت نے ان کو بہت ہی متاثر کیا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے والد مولوی سراج الدین احمد نے نواب محسن الملک سر سید احمد خاں کے بعد مسلمانوں کے لیڈر بنے۔ بقول سر رضا علی۔

"محسن الملک کا شمار دنیا کے سب سے بڑے مقرروں میں تھا۔ تقریر کرتے وقت ان کو حاضرین پر ایسا قابو و اقتدار ہوتا تھا۔ جیسا برتن بناتے وقت کمہار کو مٹی پر۔ تحریر میں زبردست آمد ہوتی تھی۔ گفتگو کا انداز بڑا دلکش تھا۔ کشش کا یہ عالم تھا کہ جہاں ہوتے سب کی آنکھیں ان کی طرف لگی ہوتیں۔ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ دوئے سخن میری طرف ہے۔ بذلہ سنجی نے موصوف کی فطری خوش مزاجی کو اجاگر کر دیا تھا" [1]

اس کے بعد وہ مزید آگے لکھتے ہیں۔

1۔ سر رضا علی۔ اعمال نامہ۔ ص 120۔ طبع 1943ء۔ دہلی۔

"محسن الملک کی ذاتی قابلیت اور لیاقت کے ماسوا۔ انھوں نے تین اہم کام قومی زندگی میں ایسے کئے۔ جو ملتِ اسلامیہ کی تاریخ میں بیداری کا سنگ میل دکھتے ہیں۔

1۔ علی گڑھ کی خدمت

2۔ اردو کا تحفظ

3۔ سیاسی بیداری کا سنگ بنیاد (مسلم لیگ کا آغاز)

میں اپنے علم و یقین سے کہتا ہوں کہ محسن الملک نے علی گڑھ میں وہ کر جو کچھ کیا وہ تمام تر خلوص و سچائی پر مبنی تھا۔ ان میں ذاتی وقار قائم کرنے یا بڑھاپے میں سبز باغ دکھا کر اپنی ذاتی غرض حاصل کرنے کا ہرگز کوئی شائبہ نہیں تھا۔ اگر کالج کا نقصان عظیم سے بچانے کے لئے ضروری ہوتا تو وہ سید محمود سے بہت کم درجے کے ٹرسٹی کے پاؤں پکڑتے اور قدموں پر لوٹ کر دکھنے کے لئے تیار ہو جاتے"[1]

یہ سب باتیں مولانا ظفر علی خاں کی زندگی میں بھی ہوئیں اور انھوں نے بھی یہ کوشش کی کہ قوم کسی طرح بیدار ہو جائے۔

مولوی عزیز مرزا کی شخصیت اور ان کے بلند کردار کا بھی مولانا ظفر علی خاں کی سیاسی زندگی پر اثر ہوا اور مولانا ظفر علی خاں نے ان کی بہت سی خوبیاں اپنا لیں تھیں۔ بقول سر رضا علی۔

---

1 سر رضا علی۔ اعمال نامہ۔ ص 78۔ طبع 1943ء دہلی

"ان کی ذات سے دس و بیس نہیں، لاکھوں بندگانِ خدا کی بہبودی وابستہ تھی۔ ان پر قوم کی رہبری و سرداری کے لئے ملک کی نظر انتخاب تھی۔ مولوی عزیز مرزا کام کرنے میں بجلی اور محنت کرنے میں آندھی و طوفان تھے۔ دوسرے یہ کہ باوجود کثرت کار کے علمی شوق ان کو لگا رہا۔ یہی لگن انھوں نے ظفر علی خاں میں پیدا کر دی تھی۔ ان میں تیسری صفت جس کو ظفر علی خاں نے اپنایا وہ مولوی عزیز مرزا کے بے تکلف بات کرنے کی صفت تھی۔ چوتھی صفت مولوی عزیز مرزا کی قومی درد کا جذبہ اور وسعت اخلاق تھی۔ نماز کے پابند اور زندگی سادہ تھی۔ وہ صاف گو تھے۔ حیدرآباد سے جانے کے بعد مولوی عزیز مرزا نے اپنی زندگی قومی کاموں کے لئے وقف کر دی تھی۔ انھوں نے پرانے بزرگوں کی طرح ملک و قوم کی خدمت بے نفسی اور ہمدردی کے ساتھ کی۔ قومی خدمت پر کمر باندھ لی تو اسے خوش اسلوبی بے نفسی اور بے ریائی سے انجام دیا"[1]

مذکورہ خوبیوں سے مولانا ظفر علی خاں پر بہت ہی گہرا اثر پڑا اور قومی جذبہ ان کے اندر پیدا ہوا۔ اس لئے مولانا ظفر علی خاں کا سیاسی شعور پیدا ہوا اور ان کے اندر خدمت قوم کی ایسی لگن پیدا ہوئی جس نے آخر تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

---

1. ڈاکٹر عبدالحق۔ چند ہم عصر ص 69 ۔ 1960ء کراچی

حیدرآباد کے قیام نے انگریزوں کی منافقانہ پالیسیوں اور
دیانتی معلومات میں دخل اندازیوں کو جس طرح ان پر واضح کر دیا تھا۔
اور سید جمال الدین افغانی کی تحریروں نے مولانا ظفر علی خاں میں ایک جوش
اور عزم پیدا کر دیا۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد۔

"سید جمال الدین صاحب کا اصلی کارنامہ یہ تھا کہ وہ جہاں گئے۔
انھوں نے اپنی تحریک زندہ دکھنے کے لئے نئے جمال الدین پیدا
کر دیئے"[1]

زمانے کے انقلابات اور بین الاقوامی سیاسی حالات نے بھی ظفر علی خاں کے
دل و دماغ پر گہرا اثر کیا۔ اس وجہ سے انھوں نے محسوس کیا کہ اسلام کو مٹانے
کے لئے صلیبی تحریکیں اپنے عروج پر ہیں۔ ان صلیبی تحریکوں نے جن جن ممالک
کو نقصان پہنچایا۔ مولانا ظفر علی کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہو گئیں اور اپنی
شاعری اور صحافت کے ذریعے اس مظلوم طبقے کی حمایت کرتے رہے۔

30 دسمبر 1906ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس
ڈھاکہ میں نواب وقار الملک کی صدارت میں ہوا۔ یہ جلسہ مسلمان لیڈروں کا
ایک سیاسی جلسہ تھا۔ اس اجلاس میں مولانا ظفر علی خاں اپنے دوست
سید محفوظ علی کے ساتھ بمبئی سے ڈھاکہ گئے اور مولوی عزیز مرزا بھی
حیدرآباد سے ڈھاکہ پہنچے۔ اس جلسہ میں نواب وقار الملک نے ایک
اہم ترین خطبہ پڑھا۔ ان کے بعد نواب سلیم اللہ رئیس ڈھاکہ نے

1۔ مولانا ابوالکلام آزاد "الہلال" جولائی 1916ء

ریزولیشن پیش کیا۔ اس کی تائید حکیم اجمل خاں، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی نے کی ریزولیشن اس طرح سے تھا۔

"قرار پایا کہ یہ جلسہ (جو ہندوستان کے مختلف حصّوں کے ان نمائندوں پر مشتمل ہے جو ڈھاکہ میں جمع ہوئے ہیں) یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ایک ایسی انجمن قائم کی جائے۔ جس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ ہو۔ اُس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل قرار پائے۔

1۔ حکومت برطانیہ سے وفاداری۔

2۔ مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق و وقار کی حفاظت۔

3۔ دوسری جماعتوں کے خلاف مسلمانوں میں جذبات عداوت کی نشوونما کا انسداد"[1]

مسلم لیگ کا دستور واضع کرنے کے لئے ساٹھ ارکان کی ایک کمیٹی مقرّر کی گئی۔ پھر وہ دستور تمام اراکین کے پاس غور و تنقید کے لئے بھیجا گیا۔ بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔

"اس طرح ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے قیام کی تاریخ ہی عملاً ان کی سیاسی زندگی کے آغاز کا دن تھا۔ اور اس دن ہی سے مسلمان قوم کے حقوق کے تحفظ کا خیال اور ہمسایہ مسلم ممالک سے تعلقات اور ان کی بہبودی و بہتری کے لئے خواہاں رہنا ایک فوری امر تھا اور یہ بات جغرافیائی حدود سے بالاتر تھی۔ لہذا

1۔ حسن ریاض۔ "پاکستان ناگزیر تھا" ص۔ 55۔ کراچی یونی ورسٹی 1967ء

اپنی آزادی کھونے کے بعد ملت میں دوسری مسلم قوموں سے
روابط کا ایک شعور پیدا ہو گیا" 1

1911ء میں افریقہ میں طرابلس پر اٹلی کی فوجوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اٹلی کی فوجوں کا اس طرح سے حملہ کرنے پر فرانسیسی وزیر خارجہ نے کہا تھا۔ "طرابلس اب خانہ دنبور بن گیا ہے"۔ بقول سید سلیمان ندوی۔

"ہندوستان میں مسلم قوم کا ضمیر پوری طرح جاگ اٹھا تھا۔ اور شمالی ہند میں (مولانا) ظفر علی خاں مسلمان قوم کے ترجمان بن گئے تھے۔ برطانیہ نے طرابلس میں اٹلی کے قبضہ کو تسلیم کرنے میں پہل کی۔ اور بلقان میں مسٹر اسکوبتھ وزیر اعظم برطانیہ اور سر ایڈورڈ گرے وزیر خارجہ نے بلقانی ریاستوں کی فتح میں باب مسیحیت کے افتتاح کا جواب دیکھا اور طرابلس میں شہیدوں کی قربانیوں نے مسلمانوں کو جھنجھوڑ دیا" 2

اس طرح سے ایک اور جگہ لکھا ہے۔

"ہم ہندوستان کے مسلمان طرابلس کے بہت ممنون ہیں کہ اس سرزمین کے شہیدوں نے خاک و خون میں تڑپ کر اپنی نیم بسمل آواز سے ہمیں بیدار کیا" 3

طرابلس میں اٹلی کی فوجوں کے ظلم و ستم نے لوگوں کے دلوں پر بہت ہی گہرا اثر کیا۔ اس سے متاثر ہو کر مولانا محمد علی نے ایک جگہ لکھا ہے۔

1۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ ملت اسلامیہ۔ ص 334۔ کراچی یونی ورسٹی 1967ء

2۔ سید سلیمان ندوی۔ برید فرنگ ص۔ 5 کراچی 1954ء

"اٹلی کے اس ظلم وستم سے پانچ ہزار چھ سو (5600) عرب اور ترکوں میں سے 1800 سو آدمی مارے گئے اس نقصان میں ستر ملین مسلمانوں کے دل دھڑک رہے ہیں"1

ایک جگہ بانگ درا میں اقبال نے کہا ہے ؎

چمکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اٹلی نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرے گا اور طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔

"لیبیا پر اٹلی کا قبضہ، مراکش پر فرانسیسی انتداب کا قیام یہ سب واقعات 1914ء میں پیش آئے۔ ان تمام واقعات نے مسلمانوں پر گہرا اثر ڈالا اور برطانیہ پر بہت نکتہ چینی ہوئی"2

طرابلس کی امداد کے لئے ہندوستان میں چندہ اکٹھا ہونے لگا 1912ء میں ترکی کے خلاف جنگ شروع ہو گئی۔ اس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں ہمالیہ سے لنکا تک غم و غصہ کی آگ بھڑکا دی۔ اس سلسلے میں علی گڑھ کے طلباء نے اپنی مرضی سے خدمت کی پیش کش کی اور کئی بڑے ڈاکٹر اس میں اپنی خدمت دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ بقول عبداللہ بٹ۔

"مولانا ظفر علی خاں نے انجمن ہلال احمر کے لئے چندہ جمع کرنا

1۔ مولانا محمد علی۔ ایڈیٹر کامریڈ۔ ہفتہ وار 20 اکتوبر 1911ء
2۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ ملت اسلامیہ۔ ص 334۔ کراچی یونی ورسٹی 1967ء

شروع کیا اور ترکی کے وزیر اعظم کی خدمت میں وہ روپیہ پیش کرنے
کے لئے روانہ ہو گئے"[1]

۱۱ دسمبر 1914ء کو یورپ کا سفر شروع کیا اور ولایت تشریف لے گئے۔ وہاں سے فرانس اور دوسرے ممالک سے ہوتے ہوئے قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ جنگ بلقان میں جو علاقے ترکی کے قبضے سے نکل کر بلقانی ریاستوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ ان میں سے بہت سے مسلمان اناطولیہ آنا چاہتے تھے۔ اس لئے حکومت ترکیہ نے ان مہاجرین کے لئے نو آبادیوں کے قیام کی تجویز کی۔ مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں نے 'کامریڈ' اور 'زمیندار' کے ذریعے ان نو آبادیوں کی تجویز کو بہتر سے بہتر صورت میں کامیاب بنانے کے لئے زبردست جدوجہد کی تھی۔ قسطنطنیہ سے واپسی کے بعد مولانا نے مصر کے علماء سے ملاقاتیں کیں۔ جب آپ وہاں سے رخصت ہوئے اور جولائی 1913ء میں بمبئی آ گئے۔ یہاں آپ کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ اس کے بعد مولانا ظفر علی خاں 3 اگست 1913ء کو لاہور پہنچ گئے۔ 13 اگست 1913ء کو کانپور میں مسجد کا ایک حادثہ پیش آیا۔ جو کہ سڑک کو سیدھا کرنے کے لئے مسجد کے غسل خانے کو گرا دیا گیا تھا۔ مزاحمت کرنے پر بے گناہ مسلمان بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کا خون بہا دیا گیا۔ اس واقعے سے مولانا چپ بیٹھنے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر اور اخبار کے ذریعے بہت کچھ لکھا اور اس سلسلہ میں 18 ستمبر 1913ء کو "زمیندار" اخبار کی ضمانت ضبط ہو گئی اور جب ان کو اپنی گرفتاری کا معلوم ہوا تو دوبارہ

1۔ عبداللہ بٹ۔ زمیندار گولڈن جوبلی نمبر جنوری 1953ء۔

ولایت چلے گئے۔

مولانا ظفر علی خاں ایک سال کے بعد 5 اکتوبر 1916ء کو انگلینڈ سے واپس آئے تو فوراً ہی نظربندی کا حادثہ پیش آگیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کے سامنے ان کے دو مرتبہ ٹرکی کے دورے سے پہلے ہی سے ان کی نظریں تھے۔ کیونکہ ترکوں کا رجحان جرمنی کی طرف تھا۔ اس وجہ سے آپ کو ڈپٹی کمشنر کی طرف سے کوٹھی پر رہنے کو کہا۔ آپ کمشنر کی کوٹھی پر گئے اور وہاں پر نظربندی کا حکم دکھا دیا گیا اور کرم آباد (جو کہ مولانا کا وطن تھا) میں نظربند کر دیا گیا۔ دورانِ نظربندی جنوری 1916ء میں انھوں نے سر مائیکل اڈوائر کی گورنمنٹ کو اپنی طرف توجہ دلائی کہ انھوں نے نظربندی سے رہا کیا جائے۔ تاکہ وہ ذریعہ معاش کے لئے کوئی تدبیر کر سکیں۔ اس وجہ سے 1917ء کے شروع میں ایک ہفتہ وار ادبی رسالہ "ستارہ صبح" کے نام سے کرم آباد سے نکالنے کی اجازت مل گئی۔

مولانا ظفر علی خاں کی دسمبر 1919ء میں نظربندی کی پابندی ختم ہونے کے بعد امرتسر کانگریس کے جلسے میں شریک ہوئے اور ہندو مسلمان لیڈروں کے ساتھ خلافت کے مسئلے پر بھی خصوصی بات چیت کی۔ کیونکہ خلافت کانفرنس و کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بھی امرتسر میں ہوئے۔ اس وقت تک بہت سے سیاسی قیدی رہا ہو چکے تھے۔ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی بھی رہا ہو گئے۔ اس وجہ سے امرتسر میں کافی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ جب مولانا ظفر علی خاں رہائی کے بعد کانگریس کے جلسے میں آئے تو ان کی وطن دوستی

کے جذبے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے انھوں نے کانگریس کے جلسے میں صاف الفاظ میں ان تمام غلط فہمیوں اور شک و شبہ کی تردید کی اور وطن کے لئے اپنی قربانی سے دریغ نہ کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ جو تقریر مولانا ظفر علی خاں نے کی اس کا ایک حصّہ اس طرح سے ہے۔

"میرا ضمیر صاف ہے۔ اور میرا دامن بے داغ۔ میری سرگرمیاں عوام پر خود بخود ثابت کر دیں گی کہ ان کی طرف سے مجھ پر جو الزام لگایا جا رہا ہے وہ بے بنیاد اور جھوٹا ہے۔ انگریزوں کے نزدیک میں پیشہ خار کی طرح کھٹکتا رہا۔ جس نے پیشہ مجھے فرمن استعماد برطانیہ کے لئے برق سمجھا ہے۔ اس کا ظلم و تشدد جب مجھے وطن کے مقدس راستے سے ہٹانے میں ناکام رہا لہٰذا اس نے مجھے عوام کی نظروں سے گرانے کے لئے یہ ذلیل طریقہ اختیار کیا۔ اور عوام میں پوری طاقت سے یہ مشہور کرنے کی کوشش کی کہ میں نے برطانوی استبداد کے سامنے گردن جھکا دی ہے۔ اس الزام کے جواب میں میں کوئی صفائی پیش نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جو گردن خدا کے حضور میں جھکنے کی عادی ہے۔ وہ برطانوی اقتدار کی دہلیز پر کبھی سرنگوں نہیں ہو سکتی۔ جس جبین نیاز پر توحید کی مہر ثبت ہو چکی ہے۔ وہ انگریز کے آستانہ جلال پر کبھی جھک نہیں سکتی۔ میری زندگی وطن کی آزادی کے لئے وقف ہے، میرا مقصد حیات یہ ہے کہ یہ گوری چمڑی والے ہندو ڈاکو میری زندگی میں سرزمین ہندوستان سے بوریا بستر

لپیٹ کر جس سرزمین سے آئے ہیں وہیں چلے جائیں"[1]

جون اگست 1920ء کا زمانہ تحریک عدم تعاون کا زمانہ تھا۔ اس تحریک کو ہندوستان کے مختلف حصوں میں مولانا ظفر علی خاں نے اپنی تقریروں کے ذریعے پھیلانے میں سرگرم رہے۔ اپریل 1920ء سے "زمیندار" اخبار ایک بار پھر سے جاری ہو چکا تھا اور مولانا ظفر علی خاں کا دفتر ان تحریکوں کا مرکز تھا۔ سیاسی رہنما ان کے دفتر میں آتے رہتے تھے۔ کیونکہ مولانا ہندوستان کی سیاست کے تین بڑے لیڈروں میں سے ایک تھے۔ ایک مولانا محمد علی دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد اور تیسرے خود مولانا ظفر علی خاں۔

اسی زمانے میں مولانا مجلس خلافت پنجاب کے سکریٹری تھے۔ رہائی کے بعد انھوں نے مرکزی مجلس خلافت کے تحت مختلف مقامات پر تقریریں کیں اور خلافت کے مفہوم کو واضح کیا۔ اسی درمیان اگست 1920ء میں مولانا ظفر علی خاں کو ضلع کیمبل پور میں تقریر کرنے کا موقع ملا۔ جہاں انھوں نے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد کلکتہ چلے گئے۔ کیونکہ وہاں پر ان کے مقدمے کی تاریخ تھی۔ بقول اشرف عطا۔

"وہ 15 ستمبر 1920ء کو حسب ہدایت مرکزی خلافت کمیٹی چلکوٹ گودے کی مقدمے کی سماعت کے لئے کلکتہ سے واپسی پر مری جا رہے تھے کہ لاہور ریلوے سٹیشن پر ایک یورپین ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ان کو قانون تحفظ ہند کے تحت گرفتار کر لیا۔ ان کی گرفتاری

1۔ اشرف عطا: "ظفر علی خاں" ص 72 ۔ طبع 1962ء لاہور

کا سبب حضرو ضلع کیمبل پور کی اگست والی تقریر تھی اور
سرکار کی طرف سے مقدمہ قائم کر دیا گیا"[1]

ایک جگہ "پیسہ اخبار" میں لکھا ہے۔

"20 ستمبر 1920ء کو مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی مولانا کی
طرف سے کوئی وکیل پیش نہیں ہوا۔ انھوں نے عائد کردہ الزامات
سے انکار کیا اور جب مقدمے کی کارروائی ختم ہوئی تو صرف ایک تحریری
بیان داخل کیا"[2]

اس کے بعد آگے لکھا ہے۔

"27 اکتوبر 1920ء کو فیصلے کے دن کامل چاند گہن تھا۔ اس خبر
(سزا کے فیصلے) کے خلاف احتجاج کے لئے سردار سردول سنگھ
کوشیر کی صدارت میں موچی دروازے کے باہر لاہور کے شہریوں
کا ایک جلسہ ہوا اور اس جلسہ میں منشی تاج الدین سابق
ایڈیٹر "امام" لاہور نے فی البدیہہ ایک قطعہ سنایا ؎

اس درجہ آج غم دل چرخ کہن میں ہے۔
یعنی ظفر علی کے یہ رنج و محن میں ہے۔
ظلمت میں پائے سرخی علم و ستم بھی ہے
وہ دیکھ لو کہ آج قمر بھی گہن میں ہے"[3]

---

1 اشرف عطا: مولانا ظفر علی خاں، ص 73 1962ء لاہور۔
2 پیسہ اخبار، 20 اکتوبر 1920ء لاہور
3 " " 28 اکتوبر 1920ء لاہور

مولانا ظفر علی خاں کی ہمدردی میں امرتسر میں ڈاکٹر سیف پال کی صدارت میں جلیاں والہ باغ میں جلسہ ہوا اور ان کی سزا کا ذکر پارلیمنٹ میں بھی ہوا۔ لارڈ مانٹیگو نے پارلیمنٹ میں کہا۔

"محبوب شاہ سندھی کی سزا اس لئے منسوخ ہو گئی کہ انھوں نے توبہ کر لی تھی۔ لیکن مولانا ظفر علی خاں کے متعلق ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ توبہ نہ کرنے کی صورت میں ان کی سزا منسوخ نہیں کی جائے گی"[1]

ایک جگہ آغا حفدر وکیل "زمیندار" اخبار میں اداریہ کی صورت میں لکھتے ہیں۔

"ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مقدمہ میں بجز ایک منشیات کے تمام کے تمام مقدمہ بنانے والے اور گواہی دینے والے اُسی سردارِ اُمتِ رسول اللہ و خدا کے نام لیوا ہیں۔ جس کی اُمت کو تباہی سے بچانے اور جس کی خاکِ پاک کو غیروں کی ٹھوکروں سے محفوظ رکھنے کے لئے ظفر علی خاں نے آواز بلند کی۔ یہ استغاثہ چوہدری سلطان احمد صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کیمبل پور اور سید لال شاہ صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس کی سعی و کوشش سے مقامی حکومت کو بھیجا گیا۔ جو گواہ اس امر کے گذرے کہ انھوں نے حکومت کے کہنے پر مولوی ظفر علی خاں کی آمد سے قبل بھی اور بعد میں بھی حکومت کو تمام خطرات اور حالات سے

---

[1] پیسہ اخبار، 9 دسمبر 1920ء لاہور

آگاہ کیا تھا۔ بدقسمتی سے مجسٹریٹ انگریز اور سرکاری وکیل سکھ ہیں اور مجسٹریٹ کے پیشکار بھی آغا عبدالحسن مسلمان ہیں۔ اس طرح سے تمام کاروائی اسلامی تھی" 1

ایک جگہ 'زمیندار' میں لکھا ہے۔

"27 اکتوبر 1920ء کو اسپیشل مجسٹریٹ نے فرد جرم عائد کر دی اور 5 سال قید بامشقت کالا پانی کی سزا زیر دفعہ 123 الف تعزیرات ہند دی گئی اور مزید ایک ہزار روپیہ جرمانہ بھی عائد کیا گیا۔ بصورت عدم ادائیگی دفعہ جرمانہ چھ ماہ قید بامشقت بھگتنی ہوگی۔ یہ سزا 28 اکتوبر 1920ء سے شروع ہوئی اور 31 دسمبر 1924ء کو ختم ہوئی (گویا چار سال دو ماہ چار دن قید میں رہے) غرض انھوں نے دوران مقدمہ برطانوی وزارت پر بے باکانہ نکتہ چینی بھی کی۔ اور استغاثہ کے گواہوں کے کردار پر بھی انھوں نے اپنے تحریری بیان میں یہ بات بھی واضح کی کہ حکومت برطانیہ موجودہ مسلم آزاد پالیسی کے سبب اس کا زوال بھی لازمی ہے۔ اور جب تک ہیجان و اضطراب اور سیاسی افراتفری کی موجودہ کیفیت کا باقی رہنا بھی یقینی ہے" 2

'انڈیپنڈنٹ' الہ آباد نے ان واقعات پر اس طرح سے تبصرہ کیا ہے۔

"مولانا ظفر علی خاں اور پنڈت رام نرائن پر بغاوت کا مقدمہ

---

1. آغا حامد وکیل، سیالکوٹ۔ اداریہ: زمیندار 9 اکتوبر 1920ء
2. زمیندار 19 اکتوبر 1920ء لاہور۔

چلانا اور اس طرح ان کی آڑ میں تکلیفیں پہنچانا روزمرہ کی کارروائیوں کا جزو بن گیا ہے۔ اس سے ہمیں کوئی استعجاب نہیں ہوتا۔ اگر مولوی ظفر علی خاں کی تقریریں باغیانہ ہیں تو آزادی ہند کے سلسلے میں کوئی آدمی ہوگا جس نے واقعات پنجاب اور مسئلہ خلافت پر کوئی تحریر نہ لکھی ہوگی یا تقریر نہ کی ہو۔ وہ قانون کی رو سے محفوظ رہ سکے اور دفتری حکومت کا طریقہ کار ہماری سمجھ سے بالاتر ہے"[1]

انگریزوں نے تحریک خلافت کے خلاف ہندوؤں کو ہر طرح سے یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ یہ تحریک ہندوؤں کے خلاف ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اگر مسلمانوں کا براہ راست تعلق سرحد پار مسلمانوں سے ہو گیا۔ تو یہ سب مل کر ہندوؤں کو ہندوستان سے باہر نکال دیں گے اور ہندوستان پر دوبارہ قبضہ کر لیں گے اس طرح اس ڈر سے ہندو مسلم اختلاف پیدا کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں ایک طرف شدھی کی تحریک شروع ہو گئی اور دوسری طرف ہندو مسلم فسادات ہندوستان میں ہونے لگے۔ خلافت کانفرنس سے خود نہرو بھی گھبرا گئے تھے۔ اور انھوں نے کہا تھا کہ۔

"خلافت کانفرنس سے یہ دیکھ کر اور بھی دھڑکا لگا کہ اس تحریک خلافت کی روز افزوں ترقی کے ساتھ جذبہ مذہب کو بھی روز افزوں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ مسٹر اخلاق شیروانی کے چہرے

---

[1] "پیسہ اخبار" 30 اکتوبر 1920ء لاہور

پر ڈاڑھی، مسٹر مجید خواجہ کے چہرے پر ڈاڑھی اور سب سے بڑھ کر خوفناک وجود علی برادران کا، علی برادران خود بھی مذہبی خیال کے تھے اور اس آگ کو ہوا دے رہے تھے"[1]

کانگریس کے اتحاد اور تحریک خلافت کو ناکام بنانے کے لئے جو کوششیں کی گئیں۔ ان میں ہندوستان کے مسلمانوں کی توجہ عالم اسلام کی پریشانیوں کی طرف تھی۔ ہندوؤں کو مسلمان افسروں اور سرکاری سیاست دانوں کے ذریعہ یہ باور کرا دیا گیا کہ مسلمانوں کا رخ ہندوؤں کو غلام بنانے کی طرف ہوگا۔ اس سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ جب مولانا ظفر علی خاں قید سے رہا ہوئے تو اس کے بعد ان الفاظ میں اداریہ لکھا۔

"یہ اشتعال انگیزیاں ہندوؤں کی جداگانہ تنظیم کے لئے شروع کی گئی ہیں۔ جداگانہ تنظیم کا خیال ہی مسلمانوں پر بے اعتمادی کا قطعی ثبوت ہے۔ لوگوں کے جذبات قومی تحریک نے خاصے مشتعل کر دیئے تھے۔ گاندھی جی کی قید کے بعد قومی تحریک کا نام لیا۔ لہٰذا ہندوؤں کی جداگانہ تنظیم (ہندو مہاسبھا) کا غلغلہ بلند ہوا۔ عام ہندو نہایت آسانی کے ساتھ اس رو میں بہہ نکلے اور ہندوؤں کے تفرد و تجرد اور انقطاع و علیحدگی کی یہ تحریک تیزی کے ساتھ ترقی کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ہندو مسلم تصادم کے اسباب بڑھنے لگے اور آج ہم ایک ملتان میں

1۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی۔ محمد علی کی ذاتی ڈائری ص: 250 1954ء اعظم گڑھ۔

بیسیوں ملتانوں کا ماتم کر رہے ہیں اور جو لوگ 1919ء کے آغاز سے 1922ء تک اپنے اتحاد کے بل پر دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے اقتدار میں زلزلہ افگن تھے۔ آج مخالفین کے تمسخر استہزاء کا نمونہ بنے ہوئے ہیں"[1]

جب ہندوستان میں تحریک ترک موالات ختم ہوئی تو مسلمان رہنما تقریباً سب جیل میں تھے۔ مسلمانوں نے آزادی کے تصور کے نشہ میں سرشار ہو کر ہندوؤں پر اعتماد کیا کہ خلافت کی جو باتیں تھیں وہ کانگریس کے ہاتھ میں دے دی اور یہ بھول گئے تھے کہ ان کی سیاسی جماعت مسلم لیگ کے نام سے پہلے سے موجود ہے۔ جس کے ہاتھ میں اس کی قیادت ہونی چاہئے بقول شورش کاشمیری۔

"جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ تحریک خلافت نے ہندو مسلم اتحاد کا جو منظر پیش کیا تھا اس سے انگریز خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اس لئے انھوں نے اس تحریک کے حالات کو دیکھ کر ہندو مسلم اتحاد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر ڈالا۔ وہ پنجاب میں تو بالکل یہ اتحاد چاہتے ہی نہیں تھے۔ اتحاد کا کیا ذکر؟ انھیں مسلمانوں میں کسی اسی تنظیم یا سیاسی تحریک کا وجود ہی گوارہ نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے پنجاب کو فوجی صوبہ بنا ڈالا تھا۔ اور اس کے مختلف عوامل و عناصر کو اس طرح قابو میں رکھا تھا کہ وہ

1۔ "زمیندار" لاہور اداریہ۔ 24 اگست 1940ء

برطانوی مقاصد پورا کرنے کے لئے مختلف المذاہب ہونے کے باوجود ایک تھے۔ لیکن اپنے ملکی مفاد میں ایک دوسرے کے خلاف تھے"[1]

1922ء میں اصل خلافت کمیٹی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لیکن تھوڑا بہت 1925ء تک باقی رہا۔ مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں کی آویزش کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بات اتنی بڑھ چکی تھی کہ جن لوگوں پر حج واجب ہو چکا ہے۔ وہ اپنے فریضہ کو اصلاح حال تک ملتوی کر سکتے ہیں۔ بقول حسن ریاض۔

"پنجاب خلافت کمیٹی (جس کے سربراہ مولانا ظفر علی خاں تھے) اور مرکزی خلافت کمیٹی میں اس طرح آپس میں گندگی اچھل رہی تھی اور اتحاد عمل کا جواب قطعی طور پر منفی ہو چکا تھا"[2]

ایک جگہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے۔

"1927ء میں نہ کہیں خلافت کانفرنس ہوتی تھی نہ کہیں خلافت کے ممبر باقی رہ گئے تھے۔ البتہ مولانا شوکت علی غریب بمبئی میں اپنے سینے سے چمٹائے بیٹھے تھے۔ چنانچہ جب 26 فروری 1927ء کو اس کا اجلاس ہوا تو وزیر گنج لکھنؤ کی ایک بڑھیا بولی۔ "لو خلافت پھر نکلی" گویا عوام کے دل سے اس کا زمانہ تک مٹ چکا تھا۔ اب جو نام سنا تو جیسے خواب

1۔ شورش کاشمیری: عطاء اللہ شاہ بخاری ص 81 مکتبہ چٹان 1956ء لاہور

2۔ حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا۔ ص 154 طبع 1967ء۔ کراچی

یک بیک پھر یاد پڑ گیا"[1]

1926ء میں جب تحریک خلافت ختم ہو گئی تو اس کے دو حصے ہو گئے۔ بقول چودھری افضل حق۔

"آخر کار مجلس خلافت کے اعلیٰ طبقے نے مسلم نیشلسٹ پارٹی بنالی اور ادنیٰ طبقے نے احرار کی بنیاد ڈالی۔ مولانا ظفر علی خاں اس دوسری پارٹی میں شریک ہو گئے۔ اس کا سب سے پہلا جلسہ دسمبر 1929ء کو کانگریس کے سالانہ جلسے کے موقع پر ہوا مولانا ابوالکلام آزادی کی سرپرستی اس پارٹی کو حاصل تھی"[2]

سائمن کمیشن کی آمد کا شور 1927ء میں ہوا اور اس کمیشن نے 3 فروری 1928ء کو بمبئی کے ساحل پر قدم رکھا۔ اس لئے "زمیندار" اخبار نے جو کہ لاہور سے نکلتا تھا اس کی آمد کے موقع پر اپنے ایک اداریہ میں لکھا ہے۔

"جو مواعید مدبرین برطانیہ نے اس وقت ہندوستان کے قریب فوردگان سے کئے تھے۔ وہ برلنی پرزہ کاغذ سے زیادہ اہم اور وقیع ثابت نہیں ہوئے اور جونہی آتش جنگ کے شعلے فرو ہوئے انگریزوں کی دیرینہ ہوس استعمار میں جان پڑ گئی۔ انھوں نے ہندوستان کو آزادی عطا کرنے کے بجائے اس کی ذخیروں کو

1۔ مولانا عبدالماجد دریابادی: محمد علی کی ذاتی ڈائری۔ ص 396۔ طبع 1956ء اعظم گڑھ

2۔ چودھری افضل حق: تاریخ احرار، لاہور۔

اور بھی مضبوط کرنے کا تہیہ کر لیا اور اس کے متعلق جو کارروائیاں عمل میں آئیں اس سلسلہ کی ایک کڑی سائمن کمیشن ہے"[1]

سائمن کمیشن 21 مارچ 1928ء کو لاہور سے واپس چلا گیا۔ اس وجہ سے مولانا ظفر علی خاں نے 8 مئی 1928ء کو فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے رخت سفر باندھا۔ شوق کی حالت یہ تھی کہ بقول اُن کے۔

"آج مجھ ذرہ بے مقدار کو بے تاب کر دیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے پندار کے صنم کدہ کو ویران چھوڑ کر دیوانہ وار فق و صدق، اخوت و مساوات کی اس چہار دیواری کی طرف دوڑ پڑوں جس کے ساتھ تیرہ صدیوں سے ملت بیضا کی مرکزیت قائم ہے۔ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا عازم ہوں جہاں ابھی تک اسلام کا قانون نافذ ہے۔ جہاں شریعت مطہرہ کا حکم جاری ہے۔ بیت اللہ پہنچ کر حضور خواجہ دو جہاں کے آستانہ پر باریاب ہو کر میں تو مسلمانوں کے لئے دعائیں مانگوں گا مجھے اُمید ہے کہ مسلمان اپنی پنج وقتہ دعاؤں میں مجھے بھی نہیں فراموش کریں گے۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا![2]

مولانا ظفر علی خاں فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد 9 اگست 1928ء کو عرب سے واپس ہوئے اور 23 اگست 1928ء کو ہندوستان آ گئے تھے۔

1۔ اداریہ "زمیندار" اخبار 9 فروری 1928ء لاہور۔

2۔ اداریہ "زمیندار" اخبار 6 مئی 1928ء لاہور۔

واپسی پر انھوں نے ایک بیان میں کہا۔

"میں 9 اگست کو مصر سے روانہ ہو کر 23 اگست کو ہندوستان پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ابنائے وطن سائمن کمیشن کی ہند میں آمد کے مسئلہ پر بحث و تمحیص میں مشغول ہیں۔ یہ ایک افسوس ناک امر ہے کہ وطن سے میری غیر حاضری کے دوران کئی ایک صوبہ جاتی کونسلوں نے ملک کے مفاد سے غداری کی ہے۔ اور انھوں سائمن کمیشن سے اشتراک عمل کا پروگرام بنا لیا ہے لیکن بہر حال کونسلیں ساری ہندوستانی قوم کے منزاف نہیں ہیں اور مرکز ہند اس سے قطعاً متاثر نہیں ہوا۔ چنانچہ نہرو رپورٹ اس کی شاہد ہے۔ اگرچہ مجھے اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مجھے ہندوستان کو نو آبادیات کا درجہ دینے کے سلسلے میں حکومت کی تجویز سے مایوسی ہوئی ہے کہ میں ہندوستان کے لئے مکمل آزادی کے حصول کا حامی ہوں۔ کاش کہ نہرو کمیٹی کے اعتدال پسند ارکان اس امر پر غور کرتے کہ برطانیہ سے ہندوستان کے لئے نو آبادیات کے درجے کی حکومت حاصل کرنا ایسا ہی مشکل ہے۔ جیسا مکمل آزادی حاصل کرنا۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم برطانیہ سے ایک بلند ترین نصب العین کے حصول کا مطالبہ کرتے تو اس میں کوئی نقصان نہیں تھا"[1]

1۔ "زمیندار" 28 ستمبر 1929ء لاہور

ایک جگہ چودھری افضل حق نے تاریخ احرار میں لکھا ہے۔

"ظفر علی، ڈاکٹر عالم، میاں سراج الدین، نہرو رپورٹ کے مطابق مخلوط انتخاب کے حق میں تھے۔ یہ وہ ذہن بھی عجیب تھا۔ وہ نہرو رپورٹ کے حق میں بھی نہ تھے اور مسلمان کانگریس کارکنوں کے مخلوط انتخاب کے خلاف اعلان کرنے کے بھی خلاف تھے۔ اسی لئے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کرنے کے بعد لوگ جداگانہ انتخاب پر واپس چلے گئے"[1]

مہاتما گاندھی نے 13 مارچ 1930ء کو ستیہ گرہ کا اعلان کیا تو ہندوستان کے ہر حصہ میں قانون توڑنے کے خلاف تیاریاں شروع ہو گئیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا ہندوستان مقابلے پر آ گیا ہے۔ سرکاری ملازموں نے اپنی نوکری چھوڑ کر قومی تحریک میں شریک ہونے کا اعلان کیا۔ اس وجہ سے قیدیوں سے جیل بھر گئے۔ پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر محمد عالم، ڈاکٹر سیف الدین کچلو یہ سب قید و بند کا شکار ہو گئے تھے۔

بھگت سنگھ، راج دیو اور سکھ دیو 23 مارچ 1931ء کو پھانسی دے دی گئی۔ اور ان کی لاش کو ٹکڑے کر کے دریائے ستلج کے کنارے جلا دیا گیا۔ اس وجہ سے لاہور میں ایک جلوس نکلا۔ جو کہ منٹو پارک میں جا کر ختم ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس موقع پر کچھ اشعار کہے۔

1۔ چودھری افضل حق، تاریخ احرار۔ ص۔ 100۔ لاہور

دبا دینا کسی مظلوم کی آہوں کو سینہ میں

کسی بے کس کو ساری عمر آنسو خون کے رلوانا

ہے جن کے دل میں آزادی کی رضی ان نوجوانوں کا

وطن سے عشق کی بنیاد پر سولی پر لٹکانا

بہا دینا کسی کی لاش کو متلج کی موجوں میں

کسی کی لاش اٹک کے پار خاک وخوں میں تڑپانا

زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ڈالے سے

خود اپنی ہی دعا یا سے پڑا ہے جس کو ٹکرانا [1]

مولانا ظفر علی خاں کو 18 رجون 1931ء کو مدد اس کے لئے بلایا گیا اور ان سے وہاں پر حالات حاضرہ پر سوالات کئے گئے۔ 13 رجولائی 1931ء کو وادی کشمیر میں قرآن شریف اور مسجد کی بے حرمتی کی گئی۔ اس کے بعد ستمبر 1931ء کے دوران ہی کشمیر میں نہتے مسلمانوں پر گولی چلنے کا واقعہ پیش آیا۔ مہاراجہ کشمیر مسلسل ظلم اور ڈوگرہ گردی نے مسلمانوں کے دل ہلا دیئے۔ اس سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خاں نے 13 رستمبر 1931ء بروز جمعہ شاہی مسجد میں احرار کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا

"کشمیر کے مسلمان ریاست کے مسلم آزاد بد دماغ حکام کے ہاتھوں ایک عرصے سے بدوف ناوک بنے ہوئے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ اگر اونٹ ایسے عظیم الجثہ حیوانوں کی پشت پر بھی تنکا

1۔ بہارستان۔ ص 357

دکھنا شروع کر دے اور اس کی قوت تحمل کا لحاظ رکھے بغیر تنکے دکھتے چلے جائیں تو آخر کار ایک تنکا ایسا ہوگا کہ جس کے دکھتے ہی اس کی ہڈی چور چور ہو جائے گی۔ جب کشمیر کے مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ حکومت کشمیر مسلمانانِ کشمیر کو مٹا دینے پر تل گئی ہے۔ تو وہ بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر اور کفن سر سے باندھ کر نکل آئے"[1]

ایک تقریر میں مولانا ظفر علی خاں نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ دریافت کیا۔

"مسلمانو! بتاؤ کیا تم انگریز سے ڈرتے ہو۔ تم انھیں اپنے خیالات عالیہ سے تلعب کرنے کی اجازت دے سکتے ہو۔ (آوزیں) "نہیں ہرگز نہیں"[2]

اس کے بعد انھوں نے آگے فرمایا۔

"مجلس احرار کے پیش نظر کشمیر میں ذمہ دار حکومت کا قیام ہے۔ میں نے کشمیری نمائندوں کے اصرار پر ایک محضر نامہ تیار کیا تھا۔ اس میں ذمہ دار حکومت اور اسمبلی کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ لیکن وزیر اعظم نے اس کے متعلق کہہ دیا کہ ہم اسے منظور نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس سے مہاراجہ کے وقار کو صدمہ پہنچا ہے"[3]

1۔ زمیندار - 17 ستمبر 1931ء لاہور

2۔ مولانا ظفر علی خاں۔ تقریر۔ زمیندار 17 ستمبر 1931ء لاہور

اس تقریر کے دوران آپ نے وزیر اعظم کشمیر سے معلوم کیا۔

"کیا آپ مہاراجہ کشمیر کو جارج پنجم بنانا چاہتے ہیں" 1

مولانا ظفر علی خاں کے احساسات عوام کے دل کی آواز بن گئے تھے اور مسلمانوں کے ان تمام مسائل اور مصائب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جو مسلمانوں کو پیش آئے اور اس کا سبب یہی تھا کہ مسلمان پر کسی اور تہذیب رنگ نہیں چڑھ سکا۔ وہ کہتے ہیں ؎

کشمیر ہے کہیں تو کہیں کان پور
پیدا ہر اک گوشہ سے شور نشور ہے
ہے تار تار پیرہن امن و عافیت
زخموں سے جسم بے گنہ چور چور ہے 2

ہائی کورٹ نے 1934ء کو فیصلہ دیا اس کے مطابق گورودوارہ کی متعلقہ عمارت کو پربندھک کمیٹی کی مقامی شاخ لاہور کے حوالہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ لنڈا بازار میں مسجد بھی تھی۔ اس پر سکھوں کا قبضہ تھا۔ 1935ء میں کمیٹی نے پرانی عمارتوں کو گرانے کے ساتھ مسجد کو گرا کر نئی عمارت تعمیر کا پروگرام بنایا اور مسجد کو گرانے کا کام شروع کر دیا۔ اس وجہ سے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر پیدا ہوئی۔ اس کے بعد مسجد گرانے کا کام روک دیا گیا۔ اس سلسلے میں شورش کاشمیری لکھتے ہیں۔

"اس زمانے میں ایبس پرتاپ سنگھ لاہور کا ڈپٹی کمشنر تھا۔

1۔ تقریر مولانا ظفر علی خاں۔ زمیندار 17 ستمبر 1931ء لاہور

2۔ بیادستان۔ ص۔ 556۔

جس کے غیر ہمدردانہ رویے نے حالات اور بھی خراب کر دیئے
اس کے بعد 8 جولائی 1935ء کو نصف شب کے وقت مسجد کی
عمارت کو دوبارہ گرانا شروع کر دیا۔ اور صبح تک اس کے گنبد گرا
دیئے گئے۔ اگلے دن مسلمانوں میں اس واقعہ سے ہیجان کی شدت
پیدا ہو گئی اور حالات نے یہاں تک رخ پلٹا کہ فوج طلب کر لی گئی
گورے فوجیوں نے بندوقیں تان لیں۔ نوجوان مسلمانوں نے اپنے
سینے تان لیے۔ ادھر گولیاں چلیں ادھر سے آگے بڑھے وہ گولیاں
چلاتے رہے۔ یہ کھاتے رہے اور جام شہادت نوش کرتے
رہے"[1]

ایک جگہ سید نور احمد لکھتے ہیں۔

"ہر مسلمان کے سینہ پر، بازوؤں پر اور لوٹیوں پر مختلف
النوع سبز رنگ کے بلے لگے ہوئے تھے۔ جن پر خدائی اسلام اور
مسجد شہید گنج زندہ باد وغیرہ تحریر تھا۔ یہ عظیم الشان جلوس
دہلی دروازہ پر آ کر ختم ہوا۔ اور وہاں کو جلسہ ہوا۔ جس میں
ملک کے چیدہ اور بہترین لیڈر شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں
مسجد شہید گنج کی واگذاری، نظر بندوں کی رہائی اور اخبارات
کی ضمانت کی واپسی کے مطالبات تھے۔ آخر کار تحریک
کی تحریک کمزور پڑ گئی۔ تا اینکہ فروری 1936ء میں قائداعظم

1۔ بحوالہ شورش کاشمیری، حالات عطاء اللہ بخاری ص 93۔ 1959ء

مسٹر جناح نے لاہور آکر اسے قطعی طور پر ختم کر دیا"[1]

ایک جگہ انتخابی منشور میں لکھا ہے۔

"1935ء کے آخر میں ایک نئی تحریک یا مجلس کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے صدر مولانا ظفر علی خاں اور سیکرٹری ملک لال خاں تھے۔ انہوں نے مجلس احرار (سرخ پوشوں کی جماعت کے مقابل نیلی پوش اختیار کی تھی) ذیل کے بیان سے مجلس اتحاد ملت کی تالیس اور ان کی کونسلوں میں جانے کے اسباب پر روشنی پڑتی ہے"[2]

ایک جگہ "زمیندار" شہید گنج نمبر میں لکھا ہے۔

"13 نومبر 1936ء کو لاہور میں عظیم الشان شہید گنج کانفرنس زیر صدارت مولانا شوکت علی ہوئی (مولانا شوکت علی کا بے نظیر استقبال کیا گیا تھا) اس کانفرنس میں ملک کے طول و عرض سے نمائندے شامل ہوئے۔ مولانا ظفر علی خاں صدر مجلس استقبالیہ تھے۔ جنہوں نے کانفرنس کی غرض و غایت اور مسجد شہید گنج کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مسجد کے گرائے جانے کے واقعات اور مسلمانوں کا حصول مسجد کے لئے اضطراب، تذبذب اور آئینی طور پر مسلمانوں کی عدالتی کارروائی پر تفصیلی روشنی ڈالی"[3]

1۔ سید نور احمد۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔ ص 171 طبع 1969ء لاہور

2۔ انتخابی منشور، شائع کردہ مجلس اتحاد ملت 1936ء لاہور

[illegible] 15 نومبر 1936ء [illegible]

مولانا ظفر علی خاں نے ان باتوں کا جو مسلم وفد اور گورنر کے درمیان ہوئی۔ ان کا ذکر کیا اور واقعات کا بھی ذکر کیا جو اس دوران مسلمانوں کو پرامن رکھنے کے لئے اختیار کئے گئے۔ اس وجہ سے آپ نے فرمایا۔

"8 جولائی سے 14 جولائی تک ہم نے مسلمانوں کو پرامن رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ 14 جولائی کو اس مقام پر پرچم اسلام لہرایا گیا۔ یہاں فیصلہ کیا گیا کہ مسلمان 5 لاکھ کی تعداد میں نیلی پوش ہو جائیں۔ اس کے بعد مجھے گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن تحریک نیلی پوش روز افزوں ترقی کرتی چلی گئی۔ جس کا مقصد تحفظ مساجد اور حصول مسجد شہید گنج ہے"[1]

تحریک کشمیر کے بعد مجلس احرار نے پھر کبھی کسی تحریک میں شرکت نہیں کی کیونکہ کانگریس کے ساتھ انتخابی مہم میں تعاون کر لیا تھا۔ بقول شورش کاشمیری۔

"مولانا ظفر علی خاں نظر بندی سے رہا ہو کر آئے تو مجلس اتحاد ملت کے ڈرامے کا نیا باب شروع ہوا"[2]

اس وجہ سے مولانا ظفر علی خاں کو احرار کے خلاف طبع آزمائی کا موقع ملا اور اس سلسلہ میں ایک نظم کہی۔ جس کے چند اشعار اس طرح سے ہیں۔

دفتر پنجاب ہے منگل سیاسیات کا ۔۔۔ بن گیا میرا قلم منگل سیاسیات کا

1۔ زمیندار، شہید گنج میں تقریر ظفر علی خاں 15 نومبر 1936ء۔ لاہور

2۔ شورش کاشمیری، احوال عطاء اللہ شاہ بخاری ص۔ 96 1956ء لاہور

گالیاں دیں، جھوٹ بول احرار کی ٹولی میں مل نکتہ یوں ہی ہو سکے گا، حل سیاسیات کا

مجلس احرار کے نیفے کی رونق بن گیا

ایک پشتو، دوسرا کھٹمل سیاسیات کا 1

مسلم لیگ کا پہلا باقاعدہ اجلاس 29 دسمبر 1907ء کو آدم جی پیر بھائی کی صدارت کراچی میں ہوا۔ اس جلسہ میں یہ طے ہوا تھا کہ صوبوں میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی جائیں۔ اور پنجاب میں پہلے ہی قائم ہو چکی تھی۔ اس سلسلہ میں مولانا ظفر علی خاں مسلم لیگ ڈھاکہ کے قیام کے بعد ہندوستان کے ہر گوشہ میں جہاں جہاں مسلم لیگ کے جلسے ہوتے وہ شرکت کرتے رہے۔ بقول جواہر لال نہرو۔

"علی گڑھ کالج کے قیام کے تیس (30) سال بعد ایک نئی نسل آغوش کالج میں تربیت پا چکی تھی اور تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی طرح ایک سیاسی کروٹ لی۔ اور کانگرس کی طرح ایک مسلم لیگ کا سنگ بنیاد بھی رکھا۔" 2

دسمبر 1915ء میں بمبئی میں مسٹر جناح نے یہ تجویز پیش کی، کہ ہندوستان کے آئین میں نئی تبدیلی ہونے والی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کی دونوں سیاسی جماعتیں کوئی اسکیم تیار کریں۔ جس میں مسلمانوں کی ضروریات اور تحفظ کا خاص خیال رکھا جائے۔ اس تجویز کو روبہ کار لانے کے لئے مسٹر جناح کی تجویز کے مطابق ایک مجلس بھی بنائی گئی۔

1۔ نگارستان۔ ص۔ 56

2۔ عنایت اللہ خاں۔ مدبر حریت ہفتہ وار 1924ء، لاہور

جس کے ارکان میں راجہ صاحب محمود آباد، سر فضل حسین، سر رضا علی، آفتاب احمد خاں، سر وزیر حسن، سر شفیع، سر برکت علی، مولانا ظفر علی خاں، فضل الحق، ابوالکلام آزاد، سر آغا خاں، سر ابراہیم رحمت اللہ، سید یعقوب حسن، سر علی امام، سر مظہر الحق، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور سر جناح تھے۔ یہ پہلی کوشش تھی جو مسلمانوں کو کانگریس سے قریب کرنے کے لئے کی گئی۔

جب مولانا ظفر علی خاں نظر بندی سے رہا ہوئے۔ اس کے بعد دسمبر 1919ء میں مجلس خلافت کمیٹی پنجاب کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس امرتسر میں ہوئے۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی۔

"مسلمان بحیثیت قوم اب تک کانگریس سے الگ تھے۔ کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور حبیب الرحمان، بیرسٹر عبدالرسول پٹنہ کے بیرسٹر مظہر الحق، بمبئی کے سر جناح جیسے دس بیس یا پچاس نشلسٹ قسم کے مسلمان گر بجھو بیٹ کر کے شریک ہوئے تو کیا؟ شرکت حال ان ہی افراد تک محدود تھی۔ عام مسلمانوں کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی۔ کانگریس کی تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ جب چہرے پر ڈاڑھیاں دکھائے ہوئے ٹوپیوں پر نشان ہلال لگائے ہوئے اور زبانوں سے نعرۂ اللہ اکبر بلند کرتے ہوئے ان دونوں بھائیوں نے کانگریس کے پنڈال میں قدم رکھا تو ساتھ

ہی ایک بڑا لاؤڈ سپیکر بن تھا اور یا علی کے نعروں سے ملک
کا ملک گونج اٹھا"[1]

مولانا ظفر علی خاں 30 دسمبر 1926ء کو قید سے رہا ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں ملک فسادات کی لپیٹ میں تھا اور قائداعظم مسٹر جناح اس وقت برابر اتفاق و اتحاد کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ اس کے بعد سائمن کمیشن کی آمد پر مسلم لیگ نے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور مولانا ظفر علی خاں نے لیگ کا ساتھ دیا۔ اس کے برخلاف سر شفیع اور ان کے رفقاء نے سائمن کمیشن سے تعاون کیا۔

28 اگست 1928ء کو ایک کانفرنس آل پارٹیز کانفرنس کے نام سے منعقد ہوئی۔ مولانا ظفر علی خاں حج سے واپس آ چکے تھے۔ اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ انھوں نے قائداعظم کے ساتھ اس کی پوری کوشش کی جہاں تک ہو سکے ہندوؤں کو تعاون کا پوری طرح یقین دلایا جائے تاکہ ملک کی سیاسی فضا خراب نہ ہو۔ بقول رئیس احمد جعفری۔

"یہ بالکل درست ہے کہ قائداعظم کی بار بار کوششوں کے باوجود کانگریس کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہ ہو سکی۔ اس سلسلہ میں مالوی جی پیش پیش تھے۔ جنھوں نے ہندو مہاسبھا کی نمائندگی کی تھی اور سچ یہ ہے کہ عملاً مالوی جی کی کوئی بھی تحریک خواہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کتنی ہی مفرت رساں

1۔ عبدالماجد دریابادی: محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ حصہ اول ص 81
1956ء اعظم گڑھ

کیوں نہ ہو۔ کانگریس کو ناگوار خاطر نہ تھی۔ اس کی مثال اس واقعہ سے دی جا سکتی ہے۔ کہ ایک دفعہ امرتسر کے ایک جلسہ میں مولانا ظفر علی خاں نے پنڈت مالوی جی کے تفرقہ انگریزی کے خلاف کچھ کہہ دیا تو گاندھی جی صدر جلسہ بگڑ گئے اور مولانا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ نے مالوی جی پر نکتہ چینی کر کے میرے سینہ میں گھونسہ مار دیا"[1]

مولانا ظفر علی خاں نے اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کیا۔ اپنی تنظیم اتحاد ملت کو مسلم لیگ میں جذب کر کے اس کے لئے ہندوستان کے دورے کئے اور جو مخالف طاقتیں تھیں ان کے خلاف تقریریں کیں اور تحریری جہاد کیا۔ جو کہ مسلم لیگ کی مخالفت میں بڑھ گئی تھیں اس لئے ایک جگہ قائداعظم نے کہا۔

"اگر مولانا ظفر علی خاں جیسے دو چار آدمی مل جائیں تو مسلم لیگ کو اس قسم کی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑتا"[2]

مولانا ظفر علی خاں سرگرم مسلم لیگی ضرور تھے۔ لیکن ان میں اخبار زمیندار اور سیاسی جلسوں نے مسلم لیگ کی تنظیم کی طرف سے عدم دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ جب وہ مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے تو اس کے بعد انھوں نے مرکزیں قائداعظم کے ساتھ پورا تعاون کیا۔

1937ء کے الیکشن کے موقع پر کانگریس نے مسلم لیگ کے خلاف

1۔ رئیس احمد جعفری۔ قائداعظم اور ان کا عہد۔ ص۔ 150۔ 1966ء، لاہور۔

2۔ ایضاً۔

جمعیۃ العلماء کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ساری ہمدردیاں
بھی کانگریس کی طرف تھیں۔ ادھر مولانا شوکت علی خاں سے اتحاد ہو چکا تھا
اس وجہ سے مولانا ظفر علی خاں تنہا جلسوں میں جاتے یا مولانا شوکت علی کے
ساتھ۔ اس لئے انھوں کی نظمیں اور تقریریں مسلم لیگ کی کامیابی کے
لئے ہوتی تھیں۔ انھوں نے علیگڈھ کے نوجوانوں سے 4 نومبر 1937ء کو علی گڑھ
مسلم یونی ورسٹی یونین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا ؎

کدھر ہیں ملت بیضا کے بت شکن فرزند
گڑے ہوئے ہیں علم جن کے آسمانوں پر

سودا اعظم اسلام کی نگاہیں اب
گڑی ہوئی ہے علی گڑھ کے نوجوانوں پر 1

مولانا ظفر علی خاں نے مسلم لیگ کی تنظیم کے سلسلہ میں مسلمانوں کو
ان کی قومیت کا احساس دلایا اور ملک کی سیاسی چالوں کا پردہ چاک کیا۔
اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان دار عمل پر آ جائیں۔ اس سلسلہ
میں مسلم لیگ پر بھی تنقید کی۔ اس سے صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلم لیگ
کی اندھی تقلید کے قائل نہ تھے۔ بلکہ انھوں نے مسلم پالیمنٹری بورڈ کے خلاف
ان کی بعض باتوں پر بے حد تنقید کی تھی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مسلم لیگ
کی تنقید کے سلسلہ میں ایک نظم کہی۔ جس کے چند اشعار اس طرح سے ہیں ؎

ہم کو دیتے تھے یہ دعوت کارفرمایانِ لیگ گر مسلماں ہے تو ہو وابستۂ دامانِ لیگ

---

1 چمنستان۔ ص۔ 94

تا کہ آزادی کا پرچم ہند میں لہرائے تو ابرِ رحمت بن کے سارے ہند پر چھا جائے تو

ایک جھنڈے کے تلے جس روز ملت آئے گی ساری دُنیا اس کے آگے خود بخود جھک جائے گی

آ جا فرزندانِ اسلام ایک مرکز پر ہیں جمع ایک اشارہ پر جو کٹ جائے وہ سر ہے کر ہیں جمع

قوم کی تنظیم سے کیا کام لیں گے دو نما

کیا فقط تنظیم ہی کا نام لیں گے دو نما 1

انھوں نے مسلم لیگ کو مقبول بنانے میں اپنی تقاریر، شاعری اور صحافت سے ہمیشہ کام لیا۔ اسی وجہ سے مسلم لیگ سے ان کا نام کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ بقول فقیر وحید الدین۔

"23 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کا عظیم الشان جلسہ لاہور میں نواب صاحب ممدوٹ مرحوم کے زیر انتظام بصدارت قائد اعظم منعقد ہوا۔ اسی موقع پر قائد اعظم نے انگریزی زبان میں ایک معرکہ آرا خطبہ صدارت بیان فرمایا جس کے ترجمے کی خدمت مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے سپرد ہوئی۔ تقریر ختم ہوئی تھی کہ مولانا مرحوم اٹھے اور قائد اعظم کی انگریزی زبان کا ترجمہ اردو میں اس قدر شگفتگی اور روانی کے ساتھ کیا کہ سامعین جھوم اٹھے۔ اس عمر میں بھی ان کا حافظہ قابل داد تھا کہ انھوں نے اتنی طویل تقریر کو یاد رکھا اور پھر اپنی خداداد ذہانت کی بدولت اردو ترجمے کی کلیاں چٹکا دیں" 2

1۔ چغتائی، عبدالرحمٰن "دو اور دو چار" ص 206۔

2۔ فقیر وحید الدین، کتاب الجہاد، ص 64، مطبوعہ 1946ء

اس جلسے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بھی ہوا
جس میں دیگر نمائندگان کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں اور سر شاہنواز بھی
اس میں شامل ہوئے تھے۔ 9 فروری 1944ء کو مولانا ظفر علی خاں نے
گورنمنٹ آف انڈیا کے رویہ پر تنقید کی اور محمد احمد کاظمی کے ڈیفنس ریزولیشن کی
تائید میں کہا کہ "گورنمنٹ نے ڈیفنس آف انڈیا کی آڑ لے کر ملک میں
دہشت پھیلا رکھی ہے"۔ یہاں تک کہ ان وکلاء کو بھی گرفتار کر لیا جاتا تھا
جو اس ملزم کی پیروی کریں جو اس ایکٹ میں پکڑا جاتا ہے۔ اس وجہ
سے چیف جسٹس الہ آباد نے لکھا تھا کہ "ہم کو معطل کر دیا گیا ہے اور ہمارے
اختیارات سلب کر لئے گئے ہیں"۔

4 نومبر 1944ء کو مولانا ظفر علی خاں نے نئی دہلی میں تحفظ مساجد کے
سلسلہ میں تقریر کی۔ انھوں نے دوران تقریر ان ممبران اسمبلی کے رویہ پر
افسوس کا اظہار بھی کیا جو اپنے آپ کو علماء دیوبند کا نمائندہ کہتے تھے اور
اس مسئلہ پر خاموشی دیے۔

ان تمام دلائل کی روشنی میں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے
کہ مولانا ظفر علی خاں نے ہر جگہ مسلم لیگ کی تائید کی اور مسلم لیگ کی
قیادت کے سلسلہ میں قائداعظم پر پورا پورا اعتماد کیا۔ اور وہ مسلمانوں
کی عظمت کے لئے قائداعظم کو اپنی ملت کا رہبر سمجھتے تھے۔ اس
بات کا اظہار انھوں نے اپنے اشعار میں اس طرح کیا ہے ؎

وہ بادہ جو آیا ہے حجستانِ عرب سے

ساقی مجھے اس بادہ کا اک جام پلا اور

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ملت ہے وطن سے

حالانکہ ہے فرمودۂ شاہِ دوسرا اور

ملت کا تقاضا ہے کہ اے خالقِ اعظم

اسلامیوں کی شان میں کچھ چار لگا اور

مغرب کے مریضوں کو جو ذوقِ دینی ہے منظور

مشرق کی سیاست کا کوئی دام بچھا اور

باتوں سے نہ مانیں گے کہ لاتوں کے یہ ہیں بھوت

ان سے جو نبٹنا ہے تو حربہ کوئی لا اور

گاندھی کے جھکانے کی جو ہے تجھ کو تمنا

اللہ کی دہلیز پہ گردن کو جھکا اور

وہ نیند میں گویا تو یہ آفاق میں گرجا

ٹیگور کا داگ اور ہے اور نغمہ سرا اور [1]

1۔ حجستان۔ ص۔ 262۔ دہلی۔ 3 دسمبر 1940ء

بحیثیت شاعر

اردو کے مشہور نقاد اور افسانہ نگار مجنوں گورکھپوری شاعری کے سلسلہ میں فرماتے ہیں :-

"شاعر کی فطرت شناس نظر اور نکتہ رس ذہن معمولی مناظر میں بھی اسرار قدرت کا مشاہدہ کر لیتی ہے۔ اس لئے وہ جو کچھ کہتا ہے۔ اندرونی اُپج سے کہتا ہے۔ جس کو ملکۂ خداداد کہتے ہیں۔ یہ ایک انفرادی چیز ہے۔ اور یہ اُپج ان اثرات و میلانات کا غیر شعوری نتیجہ ہوتا ہے۔ جن کو مجموعی طور پر نظام تمدن یا سماج کہتے ہیں"[1]

شاعر کو اس کے آس پاس کے حالات متاثر کرتے ہیں اور وہ جس مخصوص نظام کو دنیا کے لئے بہتر سمجھتا ہے۔ اس کو وہ اپنی شاعری میں پیش کر دیتا ہے۔ بقول مسعود حسن رضوی۔

"حبِّ وطن اور جوشِ قومی کے ابھارنے کا نہایت با اثر ذریعہ شاعری ہے"[2]

شاعری میں سب سے اچھا ذریعہ ان حالات کو بنانے میں نظم کا ہے۔ نظم کے ذریعہ ہر بات سامنے آجاتی ہے۔ جو بات وہ کہنا چاہتا ہے۔ شاعر اس بات کو اچھی طرح سے نظم کے ذریعہ لوگوں کے دلوں تک

1۔ مجنوں گورکھپوری۔ ادب و زندگی۔ ص 46

2۔ مسعود حسن رضوی۔ ہمارے شاعری۔ ص 174

پہنچاتا ہے۔

مولانا ظفر علی کی شاعری عقیدے کی تابع تھی اور ان کا عقیدہ اسلام کے اصولوں پر تھا۔ ان کا ایسا اصول تھا کہ وہ اپنے اصولوں سے نہیں ہٹے۔ کیونکہ اسلام کے اصولوں پر جان دینے کی آرزو ہمیشہ دہتی تھی۔ انھوں نے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے شاعری کے مزاج کو بدلا۔ دوسروں کی راہ پر نہیں چلے۔ بلکہ ایک الگ راہ نکالی اور اسلام کی تبلیغ شاعری کے ذریعہ کرنے لگے۔ غزل کا راستہ چھوڑ کر نظم کا راستہ اختیار کیا۔ نظم نگاری کو اپنا مقصد بنالیا۔ اس طرح انھوں نے ادبی، سیاسی اور صحافتی رنگ کو اپنے لئے مخصوص کر لیا اور شاعری کے ذریعہ آزادی کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی شاعری زندگی سے دور نہیں، عمل سے الگ نہیں اور غفلت اور بے عمل نہیں۔ انھوں نے شاعری میں سچائی اور حقیقت نگاری کو اپنائے رکھا۔ انھوں نے خدا کے علاوہ کسی کے آگے سر نہیں جھکایا۔ اور اپنی شاعری کے ذریعہ زمانے کو شکست دے دی۔ کیونکہ مذہب ان کا رہنما تھا۔ اس وجہ سے شاعری کا چراغ تاریک راہوں پر جلا کر زندگی کی راہ کو اونچ نیچ سے آگاہ کرتے رہے۔

پرانی شاعری غزل گوئی کا دور تھا۔ اس میں اظہار غم اپنا غم ہوتا تھا۔ لیکن جدید شاعری نے ایک شخص کے غم کو معاشرے کے غم میں بدل دیا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ۔

"اردو شاعری میں ہی نہیں بلکہ تقریباً تمام شاعری میں غور سے پڑھنے والوں کو بیکسی اور تنہائی کی یہ دردناک چیخ سنائی دیتی

ہے۔ اس کی لے بڑی خطرناک ہے۔ اس میں وہ فریاد ہے کہ جس کے شعور کی لہریں دب کر رہ جاتی ہیں۔ اردو کی پرانی شاعری میں شہر آشوب مخمس اور قطعات میں احتجاج و شکایات کی بعض صورتیں ضرور پائی جاتی ہیں۔ ان میں کچھ اجتماعی تکلیف کا احساس کم انفرادی تکلیف کا احساس زیادہ محسوس ہوتا ہے"[1]

مولانا ظفر علی خاں کو بھی قدرت نے ایک دردمند دل دیا تھا۔ انھوں نے اس زمانے کے حالات کو خوب اچھی طرح سے دیکھا تھا۔ کیونکہ اس زمانے کی زوال پذیر معاشرے کی پوری زندگی کا عکس انکی نگاہوں میں تھا۔ اس وجہ سے ظفر علی خاں ایک حقیقت پسند انسان بن گئے تھے۔ انھوں نے اسلام کے اصولوں کے سامنے کسی بھی مصلحت کا ساتھ نہیں دیا۔ حالی اور شبلی کی رہنمائی نے ان کی ذاتی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ ان کی شاعری میں قومی مسائل کا شعور انقلاب آفریں نظمیں، آزادی کے ترانے، ملت کے اصول ہر جگہ ملتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا۔

"نظم نئے زمانے کی متحرک فضا سے پوری طرح ہم آہنگ تھی اور ذہنی اضطراب ہلچل اور انفرادیت کے رجحان کو نسبتاً آسانی سے خود میں جذب کر سکتی تھی۔ اس لئے اردو شاعری میں بیسویں صدی کے آغاز میں جو دور شروع ہوا وہ دور نظم کے لئے بہت سازگار تھا۔ اس زمانے کے ہندوستان کو

1۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مباحث، مجلس ترقی ادب۔ ص 282 لاہور

دو عظیم جنگوں اور ایک اقتصادی بحران کے علاوہ حصولِ آزادی کی ایک طویل کشمکش سے گذرنا پڑا۔ ان تمام باتوں نے فضا میں تحرک اور کردار میں وہ انفرادیت پیدا کی جس کی بہترین عکاسی نظم میں ہی ممکن ہے"[1]

اس کے بعد وہ آگے لکھتے ہیں۔

"نظم ایک وسیع میدان میں پیش قدمی کرنے، دانستے کی ہر شے کو مس کرنے اور یوں ہر نئے واقعہ سے تجربہ اخذ کرنے کا نام ہے۔ نظم اپنی اہمیت اور انفرادیت کے بل بوتے پر آگے کو بڑھتی ہے اور زندہ رہنے کے لئے خود سارا اہتمام کرتی ہے۔ اور یہ ذہن سیاحت کی عکاسی ہے"[2]

نظم ایک ایسی شاعری ہے جس میں کسی ایک شخص کا غم نہیں ہوتا بلکہ اس کا غم پورے معاشرے کا غم ہوتا ہے۔ اس وجہ سے شاعر غم کو نظم کے ذریعے اظہار کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا۔

"نظم میں دکھ کی نوعیت شخصی نہیں ہوتی بلکہ وہ ان سماجی تاثرات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جس میں شاعر متاثر ہوتا ہے"[3]

اس کے بعد وہ کہتے ہیں۔

"غزل میں ابہامیت ہوتی ہے۔ لیکن نظم میں ایک مکمل شخصیت

1۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ اردو شاعری کا مزاج ص۔ 293
2۔ " " " " " ص۔ 294
3۔ " " " " " ص۔ 297

پورے طور سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور اس کے آئینہ فکر میں جو
حال و مستقبل کی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ سب قلم و قرطاس سے اس
طرح بالترتیب سامنے آتی ہے کہ افہام و تفہیم میں کوئی پیچیدگی باقی
نہیں رہتی۔ نظم فرد و سماج کے دائرے کو وسیع کرتی ہے۔ اور
ان کے روابط کو اجاگر بھی"[1]

مولانا ظفر علی خاں کی اسلام کے اصولوں پر جان دینے کی آرزو تھی۔
وہ نظم گوئی کے ذریعے آزادیِ ضمیر کے لئے برابر کوشش کرتے رہے۔
اس لئے وہ آزادیِ ضمیر کو ہندوستان کی آزادی کا مقصد سمجھتے تھے وہ کہتے
ہیں ؎

خواب جو خیال ہو گئی آزادیِ ضمیر — جو دل میں ہے نہاں وہ زباں پر عیاں نہیں
دنیا میں جتنے ملک تھے آزاد ہو گئے — آزاد گر نہیں ہے تو ہندوستاں نہیں۔
شیخ اور برہمن کا ہے دشوار اتحاد
جب تک کہ ان میں مشترک اردو زباں نہیں[2]

مولانا ظفر علی خاں نے سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور پر بھروسہ
نہیں کیا۔ اور نہ ہی کسی کے آگے اپنا سر جھکایا۔ اس لئے اپنی شاعری
اور صحافت کے ذریعہ زمانے کو شکست دے دی۔

1۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ اردو شاعری کا مزاج ص 298

2۔ ظفر علی خاں۔ چمنستان۔ ص۔ 247

مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ بہارستان

2۔ نگارستان

3۔ چمنستان

پہلا مجموعہ "بہارستان" کے نام سے ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر یہ مجموعہ منظر عام پر نہیں آسکا تھا۔ اس سلسلے میں خود مولانا ظفر علی خاں نے تحریر کیا ہے۔

"میں شاعر نہیں ہوں۔ البتہ الفاظ کی موزوں ترتیب فراگت کی وجدانی، بندش، قدرت بیان کی فراوانی کے صدقے میں افکار کو زیادہ بلند نہیں۔ قید نظم میں لا سکتا ہوں۔ واقعات حاضرہ کی ضمانت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اور از بسکہ اس میں اسلامیات کی چاشنی ملی ہوئی ہے۔ اس لئے ارباب نظر کا وہ سخن سنج طبقہ بھی جس کے نزدیک شاعری ساحری کا دوسرا نام ہے۔ میرے سادہ کلام کو ناپسند نہیں کرتا"[1]

مولانا ظفر علی خاں سے لوگوں نے کہا کہ آپ اپنے کلام کا کوئی ایک مجموعہ نکالیں۔ لیکن ان کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ آسانی سے اپنے کلام کا مجموعہ نکال سکیں۔ جب ان سے زیادہ کہا گیا تو انھوں نے "بہارستان"

1۔ مولانا ظفر علی خاں۔ زمیندار۔ 24 اگست 1945ء لاہور

کے نام سے اپنے پہلے مجموعہ کا اعلان کر دیا۔ کہ وہ بہت ہی جلد پہلا مجموعہ نکالیں گے۔ جب ان کے کلام کا مجموعہ تیار ہوا تو اس کے اندر بہت سی غلطیاں تھیں اور کاتب نے بھی کافی غلطیاں کی تھیں۔ کتابت بھی اچھی نہ تھی۔ اس وجہ سے مجموعہ کی کاپیاں دریائے راوی میں بہا دی گئیں۔

اس مجموعہ کا دوسرا ایڈیشن شیخ مبارک علی نے شائع کیا۔ اور تیسرا ایڈیشن مکتبہ کارواں کی طرف سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ان کی شاعری کا ابتدائی کلام بھی ہے۔ اس مجموعہ کو اس طرح سے مرتب کیا گیا۔

1۔ حمد باری

2۔ کتب و استفاثہ

3۔ اسلام

4۔ اسلامی روایات

5۔ سادہ صبح کے دور کی نظمیں

6۔ نوحے و مرثیے

اس طرح سے یہ مجموعہ "بہارستان" کے نام سے منظر عام پر آیا۔

مولانا ظفر علی خاں کے دوسرے مجموعے کا نام "نگارستان" رکھا۔ یہ مجموعہ 1963ء میں شائع ہوا۔ اس میں 20 جون 1936ء تک کے منتخب اشعار درج ہیں۔ اس کے صفحات 256 ہیں۔ اس مجموعہ میں مختلف عنوانات کے تحت نظمیں اور قطعات موجود ہیں۔ اس میں وہ نظمیں بھی ہیں۔ جو کہ سادہ صبح کے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں سیاسی

نظمیں بھی شامل ہیں۔ سیاسی حالات سے لے کر 1936ء کے واقعات تک اور سر افضل حسین کے انتقال پر بھی قطعہ ہیں۔ ان قطعات میں ادبی چٹکلوں نئے اشعار کی فرمائش اور مختلف شخصیتوں کی قلمی تصویروں پر ہیں۔ ان میں خواجہ حسن نظامی، کشفی شاہ، سیٹھ یعقوب کے قلمی ذاکے وغیرہ بھی شامل ہیں۔

اس مجموعہ میں دوسرے شعرا کی زمینوں میں اشعار اور اکبر کے رنگ میں نظمیں بھی ہیں۔ ان کے علاوہ آیات و حدیث کے ترجمے و تقاریر۔ اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ ہندوستان کے وہ شہر جو کہ اسلامی خصوصیات اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ایک اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں جن شہروں میں گئے ان کا بھی اور ان مقامات کی اہمیت کا اظہار اپنی نظموں میں کیا ہے اس طرح سے وہ مقامات ان کی شاعری میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے انقلاب بلوچستان، وادی جہلم، انقلاب بنگلور، چوندہ، ہنگامہ کشمیر قصہ مغلپورہ، دیوبند، سہسرام، نربدہ، مسلمانِ ہنود وغیرہ۔

اس مجموعہ میں ان افراد کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ جو کہ سیاسی مظالم کا شکار ہوئے۔ جیسے شیخ حسام الدین، زبان بندی، مجاہدین بلوچستان، شہدائے سلطان پور اور عبداللہ خاں۔ اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اسلام پر کوئی بھی آنچ آئے اور جب بھی کوئی بات اس طرح کی نظر آتی تو وہ اپنے تاثرات نظم کے ذریعے اظہار سے بغیر نہیں رہتے تھے۔

اس مجموعہ میں مولانا ظفر علی خاں نے نیچرل شاعری پر بھی کئی نظمیں کہی ہیں۔ اور کئی جگہ دعائیں اور مناجاتیں بھی ہیں۔ سب سے اہم بات اس میں معاشی مسائل کو بھی پیش کیا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عوام کی بنیادی ضرورتوں کا پورا ہونا یا پورا کرنا انھوں نے اپنا مقصد بنالیا تھا۔ اس میں بعض نظمیں تو سیاسی ہیں۔ جو کہ انقلاب کا نعرہ بلند کرتی ہیں۔ اس میں وہ نظمیں بھی ہیں۔ جن نظموں کی وجہ سے" زمیندار اخبار ضبط ہوتا رہا۔

مولانا ظفر علی خاں نے اس مجموعہ میں جگہ جگہ مسجد اور اس کے احترام اور مختلف مساجد کے شہید ہونے کے واقعات پر بھی نظمیں ملتی ہیں۔ مسلمانوں کے تہوار ہیں۔ رمضان، عید، عید الضحیٰ اور پیغام عید پر بھی نظمیں ہیں۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جو تکلیفیں اور جو پریشانیاں پیدا ہوئیں۔ اس بات کا ذکر انھوں نے اپنی نظموں میں جگہ جگہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی نظموں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 میں انتخابی آویزش، جواہر لال نہرو اور ہندو مہاسبھا پر بھی نظمیں ملتی ہیں۔ ان کے نزدیک سیاست صرف اسلام کی پاکیزہ زندگی پر عمل کرنے کا نام ہے۔ وہ اس طریقہ کے خلاف ہیں جو کہ اسلام کے اصولوں پر عمل نہ کرے۔ ان کی نظموں کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔ شریعت اور طریقت کی آویزش، مزبدہ کی لومڑی، مولوی اور مالوی، افغانِ مشرق، تہذیب کا بتخانہ، سنگ مفتون وغیرہ۔

مولانا ظفر علی خاں نے ان تمام اہم چیزوں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ جن کی وجہ سے مسلمان زمانہ کی عیارانہ چالوں سے باخبر رہیں۔ اس لئے وہ مسلمانوں کو ان باتوں سے الگ رکھنا چاہتے ہیں کہ بدعملی کی وجہ سے تباہ نہ ہو جائیں اور خاص طور سے علی گڑھ کے نوجوانوں کی طرف وہ دیکھتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ کسی نے اسلام پر کوئی اہم غلط بات کہی تو ان نوجوانوں کو آگے کرتے ہیں۔ خود بھی دشمنوں کے منہ بند کرنے کے لئے سب سے آگے میدان میں آجاتے ہیں۔

اس مجموعہ میں بہت سے معاصرین کے تذکرے یا ان کے قلمی خاکے بھی ہیں۔ جیسے غلام بھیک نیرنگ، سر علی امام، لالہ لاجپت رائے، سر اقبال اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ۔ اس میں جو سب سے اہم چیز نظر آتی ہے۔ وہ آیات الٰہی کی وہ نظمیں اور ان کے ترجمے ہیں جن سے قرآن کے مفہوم کو واضح کیا ہے۔

I am very sorry 2691 code

مولانا ظفر علی خاں کا تیسرا مجموعہ 15 اگست 1936ء سے لے کر 10 مارچ 1941ء کے کلام پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ 1944ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ "چمنستان" کے نام سے چھپوا کر پبلشرز یونائیٹڈ لاہور سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ 284 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں وہ اہم نظمیں اور قطعات موجود ہیں جو کہ سیاسی، اسلامی اور معاشرتی لحاظ سے بہت ہی اہمیت رکھتی ہیں۔ سیاسی نظموں کے علاوہ اس میں ان کے بلند ادبی فکر کا نمونہ بھی ملتا ہے جو کہ ان کی شاعری کو ان کا اونچا مرتبہ دیتا ہے۔ اس مجموعہ میں انھوں نے

سیاسی اثرات کی زیادہ سے زیادہ نظمیں شامل کی ہیں۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان اپنی قومی حیثیت کو محفوظ رکھنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے اندر پاکستان، دیزولیوشن سے لے کر مسئلہ شہید گنج تک کے تاثرات ملتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ زمانے کی سیاسی تاریخ کا الگ اشارہ ہے۔ اس لئے اس میں وہ تمام واقعات اور سیاسی لڑائیوں کو جگہ جگہ نظموں میں پیش کیا ہے۔

اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ 'بہارستان' سے لے کر 'جہنستان' تک کی شاعری ہندوستانی قوم کی ایک مکمل سیاسی تاریخ ہے۔ جس میں زمانے کے مدوجزر، ابنائے وطن کی دشیہ دوانیاں، انگریزوں کی کارستانیاں، اپنوں کی سازشیں اور غیروں کی عداوتیں۔ اس مجموعہ میں تفصیل سے بیان کی ہیں۔

مسلمانوں کے اتحاد کے مولانا ظفر علی خاں زبردست حامی تھے۔ ہندوستان کے لئے بھی اتحاد چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے شیعہ سنی کشمکش کے خاتمہ کے لئے بھی کئی جگہ نظمیں اور قطعات لکھے ہیں۔ اس میں ان مسلمان رہنماؤں کا ذکر بھی ہے۔ جنھوں نے مسلمانوں کے فائدے کے لئے کام کئے۔ جیسے سر فضل حسین، سید غلام بھیک نیرنگ اور قائداعظم محمد علی جناح وغیرہ۔ ان کے فلسفہ زندگی کا بھی ذکر ملتا ہے۔

اس مجموعہ کی ایک خصوصیت ان کے وہ قلمی خاکے بھی ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کے لطافتِ بیان اور تخیل نے ان کرداروں کو اپنی مخصوص صفات کے لحاظ سے ایسا ممتاز بنا دیا ہے کہ اس کا جواب اردو شاعری میں نہیں ہے۔ انھوں

نے مولانا محمد علی کی وفات پر انکے متعلق کہا ؎

ہیں زندہ جس سے عہد کہن کی روایتیں — رونق اُس انجمن کی محمد علی سے تھی

اب تک لگی ہوئی جو کروڑوں دلوں میں ہے — بے تابی اُس لگن کی محمد علی سے تھی

توحید کی دمن نے بتوں کو پکڑ لیا — اور تاخت اُس دمن کی محمد علی سے تھی

سر پر لپیٹ لیتے ہیں جس کو غزا کے وقت — آدائش اس کفن کی محمد علی سے تھی

توحید کی اصول کی حرمت کے ساتھ ساتھ

ذلت پر اک وطن کی محمد علی سے تھی 1

مولانا ظفر علی خاں نے اس مجموعہ میں بہت سے شہروں اور مقامات کے تذکرے بھی کئے ہیں۔ اس وجہ سے ایک شہر اپنی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ادب میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کا ایسا کوئی شہر نہیں چھوڑا جس میں وہ گئے نہ ہوں۔ اس شہر کی اہمیت ہر کسی نہ کسی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس میں ان کی زبان میں اپنے حریفوں پر پھبتیاں بھی کسی ہیں۔

ایک خصوصیت اس مجموعہ کی یہ ہے کہ مسلم فلسفے کو قائداعظم کے فلسفے کے نام سے اور ہندو فلسفہ کو جواہر لال نہرو کے فلسفہ کی شکل میں بیان کیا ہے۔ اور اس میں انھوں نے حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ اس سے ایک نئی خصوصیت کا داخل ہو جاتا ہے۔

اس مجموعہ کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے مغرب کے کفن چور دور کے خلاف اس شدت سے آواز بلند کی ہے کہ کوئی بھی اس طرح سے اس

---

1 ہمنوا ترانہ۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 169

کے ہم آواز ہو سکتی ہے۔ جس طرح سے مشرق میں مسلمانوں کو بحیثیت قوم کے نقصان پہنچایا۔ انھوں نے ان کو نظم کے ذریعہ بیان کر دیا ہے۔ انھوں نے کبھی بھی ہمت نہیں ہاری وہ ایک سچے مسلمان کی طرح اپنا بیان کرتے رہے وہ کہتے ہیں ؎

تاریخ وطن کی جانب سے پیغام کوئی انگریز کو دے
آتا ہوا تم بھی دیکھو گے سورج لب بام آزادی کا
دنیا میں ٹھکانے دو ہیں تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تختہ جگہ آزادی کی یا تخت مقام آزادی کا 1

مولانا ظفر علی خاں کی غزل گوئی کا آغاز حیدر آباد دکن سے ہوتا ہے حیدر آباد میں شاعروں کی کمی نہ تھی۔ جیسے۔ داغ دہلوی، امجد حیدر آبادی، نظم طباطبائی، میکش اکبر آبادی، ظہیر دہلوی وغیرہ۔ مولانا نے غزل کہیں لیکن انھوں نے زیادہ زور نظموں پر دیا۔ ان کی پہلے مجموعہ 'بہارستان' میں 1899 کی غزلیں ملتی ہیں ؎

ہے مری کل کائنات اک دل امیدوار
اس پہ بھی لیکن نہیں آتا مجھے اختیار
عشق سے کرتے ہو منع بات تو کہتے ہیں سچ
حضرت ناصح مگر دل پر کسے ہے اختیار 2

---

1. بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 84
2. بہارستان۔ " " ص 582

مولانا ظفر علی خاں غزل گوئی سے بیزار ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی چند غزلیں ملتی ہیں۔ ان غزلوں میں انھوں نے وہ اصول اپنائے جو خاکی نے مرتب کیے تھے اور جو شعرا سے دیے تھے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے ماحول اور مذاق سلیم کے سبب زلف جاناں سے ہمیشہ دور ہی رہے۔ کبھی بھی اس کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی۔ کیونکہ اس وقت زلف جاناں کا نہیں ہندوستان اور ہندوستانیوں کے آزاد ہونے کا درد دل میں گھر کیے ہوئے تھا۔ اس لیے اس کے اندر اور کسی کے لیے جگہ نہیں تھی۔ ایک خاص بات جو تھی وہ یہ تھی کہ مولانا جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ ان کا دامن حسن و عشق سے پاک تھا۔ ان کی غزلوں میں سچائی آ گئی ہے اور بیان کی پاکیزگی ہر جگہ نمایاں ہے۔

وہ کافر آ نہ دل کا لینے کو امتحان ہے
تنے ہوئے ہیں ابرو چڑھی ہوئی کمان ہے

میرے جلے ہوئے دل کی بو ہے داغ میں بھی
بجلی گری ہے جس پر میرا یہ آشیاں ہے [1]

مولانا ظفر علی خاں اپنی غزلوں میں آغوشِ محبوب میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔ اور نہ ہی غزل کو اپنے اظہارِ غم کا ذریعہ بناتے ہیں۔ انھوں نے گل و بلبل کی زبان میں انسانی زندگی اور اس کی مایوسی کے واقعات بیان نہیں کیے۔ اپنے تجربے اور مشاہدے سے جو بھی اثر لیا اس کو اصلیت کے ساتھ بیان کر دیا۔ انھوں نے قومی زندگی کی ناکامی کو غزل کے ذریعہ

1۔ بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 583

سوز میں بیان کر دیا ہے ؎

میری انجمن میں روشن نہ رہا چراغ اپنا
نہ رہی شراب پہلی نہ رہا ایاغ پہلا
میری سلطنت بھی چھینی میری مسجدیں بھی ڈھائیں
وہ تھی دل کی ٹیس پہلی یہ جگر کا داغ پہلا [1]

قصیدہ کا دور بادشاہوں کا اہم حصہ اور جاگیردارانہ نظام سے وابستگی کا ایک ذریعہ تھا۔ کیونکہ قصیدہ خود شاعر کی انفرادیت اور اس کی خودی کے اظہار کا ایک خاص ذریعہ تھا۔ ان کے مجموعۂ کلام میں مندرجہ ذیل قصیدے ملتے ہیں۔

1۔ آصف جاہ ہفتم عثمان علی خاں کی تعریف
2۔ جارج پنجم کی تعریف
3۔ بیگم بھوپال کی تعریف
4۔ ملکہ وکٹوریہ کی تعریف
5۔ سر دینار الامراء کی تعریف

ایک قصیدہ آصف جاہ ہفتم کی سالگرہ کے موقع پر ذوق دہلوی کی زمین میں کہا گیا ہے ؎

نشۂ عرفان سے جب تک روح کا لبریز ساغر ہو — طراز صفحۂ توحید تا اللہ اکبر ہو
ہر الہام میں کشتی قرآن تا منثور ہو — کفِ ایمان میں جب تک گوہر دین پیمبر ہو

1۔ بہار کستان۔ ص۔ 237

الٰہی سایہ آصف جاہ کا ہم سب کے سر پر ہو

وفا پرور ہوں ہم سب بندے اور وہ بندہ پرور ہو [1]

مولانا ظفر علی خاں کی قصیدہ نگاری مبالغہ اور جھوٹ سے بہت دور ہے۔ ان کی قصیدوں میں آبرومندانہ زورِ بیان کا اظہار ہے۔ ان کا ایک قصیدہ فانی کی طرز پر ہے۔ جس میں الفاظ کی فراوانی اور زورِ بیان کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

ہوا جس کی ثنا میں تر زبان اس طرح فانی۔ وہ تھا اپنے زمانے میں بلا شک شانِ یزدانی

ابھی تک یادگار اس کی ہے باقی مشہد سر میں مسلمانوں کو پہنچے اس سے جو فیضِ روحانی ہے

آگے وہ کہتے ہیں ؎

فیصلوں پر نہیں جو دم کرتا بر ملا سن لے یہ نکتہ جس میں مضمر ہے حقیقت ایک یزدانی

عجب نادان ہیں جن کو ہے عجب تاجِ سلطانی فلک بالِ ہما کو پل میں بخشے ہے مگس دانی [2]

مولانا ظفر علی خاں کے قصیدے طویل نہیں ہیں۔ بلکہ بہت حد تک متوسط درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے قصیدوں میں قومی حمیت اور جذبہ حب الوطنی کی تحریک ملتی ہے۔ ان کے یہاں مراثی اور نوحے دلی تاثرات اور غمناک احساس کے اظہار کا نام ہے۔ جس سے شاعر کی قلبی محبت اور مرحوم کی جدائی کی وجہ سے ایک بے ثباتی، بے چینی اور کرب کا اظہار ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ۔

"ان کے غم کی تہہ بہت گہری غمِ پائمالی میں جمی ہے۔ جس ہر مٹا

1۔ بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 309

2۔ " " " " ص 233

3۔ " " " " ص 234

کے پہاڑ تہہ بہ تہہ جمے ہوئے ہیں۔ ان کی طبیعت ان کہساروں
سے مشابہ ہے۔ جن کی تہہ میں پانی کی لکیر اس کے نکاس سے بہت
دور ہو جس طرح آدمی چشمہ الیاس سے صدہا میل دور ہے۔ اس طرح
ظفر علی خاں بھی اپنی زندگی کے اعتبار سے غم زدہ آدمی معلوم
ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی ریاضت تھی کہ انھوں نے ظاہری سطح پر
الم کے پانی کو ابھرنے نہیں دیا" 1

مولانا ظفر علی خاں کے یہاں بھی مرثیے کا موضوع فضائل کی مرقع کشی ہے۔
ان کے مرثیوں پر جو ازم رنگ زیادہ غالب ہے۔ کیونکہ وہ ان مراثی میں سچے
اور مبالغہ سے دور تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے بھائی محمد اکبر خاں نے
شادی کے ایک سال بعد عارضہ تپ دق میں انتقال کیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے ان
کا مرثیہ لکھا جو ان کے بے حد غم ناک تاثرات کا آئینہ دار ہے۔

کم بخت قضا سے کوئی شکوہ ہی کرے کیا — اس کو تو مساوات ہے پیری و جوانی
چلتے ہوئے کیوں توڑ گئے ہو میرا بازو — ابھی مجھے دی تم نے اخوت کی نشانی
کل باندھ کے سہرا ترے سر آج دریغا — چادر تری تربت پہ چڑھی مجھ کو چڑھانی 2

ایک اور مرثیہ مولانا ظفر علی خاں نے سید محمود کی وفات پر بہت ہی دردناک
انداز میں لکھا ہے۔

اے یادۂ دل آنکھ سے خوں ہو کے نکل جا — اے دیدۂ تر چشمہ خوں بن کے ابل جا
برپا ہے جہاں میں ترے بیٹے کی قیامت — اے حشر ہمیشہ کے لئے آج سے ٹل جا

1۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ : نثر اور اپنے شاعر ص 176
2۔ بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں ص 800
802

مولانا ظفر علی خاں کے یہاں قطعات کی کمی نہیں ہے۔ ان کے کلام میں ہر طرح کے قطعات مل جاتے ہیں۔ اور تاریخ گوئی کے سلسلے میں بھی قطعات مل جاتے ہیں۔ جیسے آصف جاہ ہفتم کی مسند نشینی کی تاریخ اور شیخ علی احمد جمعدار گجراتی کی وفات پر لکھتے ہیں ؎

جلالت کا مظہر تری فر شاہی — عقیدت کی پتلی مری کمتریں
جلوس نظام اور تاریخ میری — کرے گا کوئی اس پہ کیا نکتہ چینی
دکن بلکہ ہندوستان کی طرف سے — مبارک ہو تم کو یہ مسند نشینی 1

1329ھ

شیخ علی احمد جمعدار گجراتی کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ اس طرح سے کہی ؎

آج اک بزرگ قوم جہاں سے گزر گیا — چاروں طرف بلند ہے واحسرتا کا غل
اس واقعہ سے ہیں متاثر سب اہل شہر — اس غم میں سوگوار ہیں اور شباب کل
ہر دلعزیز تھا وہ خواص و عوام میں — از بسکہ اس بزرگ کا مسلک تھا صلح کل
محفل کی رونقیں علی احمد کے دم سے تھیں — ساقی جب اٹھ گیا تو نہ مینا وہاں نہ مل
تاریخ ملہمانہ ہے اس کی وفات کی
گجرات کا چراغ ہوا آج ہائے گل 2

1931ء

مولانا ظفر علی خاں کی نیچرل شاعری پر وہ تمام نظمیں ہیں جن میں انھوں نے حسن ازل کائنات کی ابتدا، سمندر اور اس کا مدو جزر، موسلی ندی

1۔ بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں ص 285
2۔ " " " ص 805

کی تباہی، لندن، صبح و شام کی کیفیت اور ندی کا ڈاک کے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ ان تمام نظموں میں ان کا تخیل جس طرح سے قدرت اور فطرت کی حکمت کو بیان کرتا ہے۔ اس سے قدرت کی عظمت اور انسان کی بے بسی کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں تشبیہات و استعارات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ سمندر کے متعلق کہتے ہیں ؎

ہیں تری پنائیاں سنجاب دامانِ خیال — اور تری جولانیاں آغوشِ فطرت کا فشار

تیرا اک اک چینِ ابرو آفتِ جانِ حزیں — تیرا اک اک غنچۂ لب لطفِ عمرِ مستعار

حسن تیرا لازوال اور عمر تیری جاوداں — ہو نہیں سکتی خزاں سے منفعل تیری بہار

نیلی نیلی تیری موجیں ہیں پرا باندھے ہوئے

یا مگر قدرت کی فوجیں ہیں قطار اندر قطار 1

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ سمندر کی موجیں کس طرح خاکِ عرب کو بوسہ دے رہی ہیں اور وہ اپنے اس تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

میں نے دیکھا ہے تجھے خاکِ عرب کو چومتے

اے خدا تیرے اس آئیں پر مری جانیں ہزار

سجدہ کرتا وہ اسے جب تک ہے تجھ میں جزر و مد

اے ترا نورِ نگہ، اس خاکِ اطہر کا غبار 2

مولانا ظفر علی خاں کی نظم نگاری میں عملی مسائل کو بیان کرنے کا انداز فلسفیانہ ہے۔ جس سے ان کی فکر کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی سب سے

1۔ نگارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 59

2۔ 〃 〃 〃 〃 ص 60

بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے موضوعات کو شاعری میں ڈھال دیا۔ اور اس خشکی کو دور کر دیا۔ جیسے خالق کائنات کی جستجو کے متعلق ان کا بیان فلسفیانہ ہے ؎

خدا کیا ہے؟ بولا شریعت نے ایک دن — تصوف کڑک کر پکارا اللہ الکل

وہی باغ ہے اور وہی باغباں ہے — وہ ہے خود ہی گل اور خود ہی بلبل

کبھی ہے وہ موسیٰ کبھی سامری ہے — کہیں وہ ہمی اور کہیں ہے وہ دلدل

شریعت نے لاحول پڑھ کر کہا یوں — یہ جا کر کسی اور کو دیجئے جل

جہالت کو سمجھی تھی میں صوفیانہ — مگر یہ تو ہے عارفانہ تجاہل

خدا کے خالق ہو مخلوق بھی ہو

حقیقت میں ہے دور دور تسلسل 1

مولانا ظفر علی خاں کا خالق کائنات کی جستجو کے متعلق انداز بیان خالص فلسفیانہ ہے۔ اور وہ خدا کی تلاش عقل انسانی کے لئے محال سمجھتے ہیں۔ کیونکہ فلسفی جس مسئلہ کو مبہم انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ اس مسئلے کو منطقیانہ انداز میں پیش کر کے ایک صحیح نتیجہ فکر سامنے لے آتی ہیں۔ اور قدرت کی نشانیاں بیان کر کے کہتے ہیں ؎

نشانیاں ہیں یہ ایسی کہ ذات باری کے — ثبوت میں انھیں سمجھیں گے قول ہم فیصل

طلب کرے کوئی اس سے بھی گر زیادہ ثبوت — تو ہم کہیں گے کہ اس کے حواس ہیں مختل

سراغ ڈھونڈیے اس کا چلا ہے عقل ضعیف — یہ خوف ہے کہیں ایمان میں نہ آ جائے خلل 2

اس کے بعد جب مولانا ظفر علی خاں معرفت الٰہی میں غور و فکر کرتے ہیں تو حیرت کی

1۔ بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 217

2۔ 〃 〃 〃 ص 12

علاوہ اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اس لئے انھوں نے ایک جگہ "مقام حیرت" کے عنوان سے روشنی ڈالی ہے ؎

مرے کس کام میری دانش مشکل کشا آئی
سمجھ تیری خدا مجھ کو نہ اے میرے خدا آئی
تصور میں بھی چھو سکتے نہ تھے ہم جس کے دامن کو
بہ کھول اس دلربا کا عقدۂ بند قبا آئی۔ 1

مولانا کے یہاں ادب کی ایک اور خصوصیت زندگی کو اسلامی اقدار کے ساتھ گزارتے ہوئے اسلامی نظام حیات کو اختیار کرنے کی کوشش تھی اور مسلمانوں کی پستی کا سبب تھا کہ انھوں نے تجارت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اس لئے انھوں نے معاشی مسئلہ پہلے کی حیثیت میں دکھا اور اسلامی اقدار کے تحفظ کا مسئلہ بنیادی حیثیت میں دکھا وہ کہتے ہیں ؎

مسلماں باندھ کر نکلا ہے اپنے پیٹ پر پتھر
مگر تم بیچ میں لاتے ہو روٹی کے جھمیلوں کو۔ 2

مولانا ظفر علی خاں نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان میں آپس میں لوگ لڑتے رہیں۔ اس وجہ سے وہ اتحاد و اتفاق کی فضا کو ہموار کرنا چاہتے تھے تاکہ ہندو مسلم دونوں ملکر صلح و آشتی کے ذریعے ایک دوسرے پر اعتماد کریں اور آپس میں مل کر رہیں۔ اس اعتماد کے سبب اقتصادی حالت ٹھیک ہو جائے وہ کہتے ہیں ؎

---

1 بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں ص 20
2 چمنستان۔ " " " ص 12

شیخ اور برہمن کو ایک آنکھ سے جو دیکھے
کرتا ہو عدل جس کا دونوں کی پاسبانی
مل جاؤ ہندوؤں سے اور دونوں مل کے کر لو
اپنے وطن میں قائم ایک ایسی راجدھانی 1

اس سے آگے وہ لکھتے ہیں ؎

شیخ اور برہمن میں بڑھی صلح و آشتی
برما میں چل رہی ہے ہوا اتحاد کی
اب بدگمانیوں کا زمانہ نہیں رہا
حاجت ہے ایک دوسرے پر اعتماد کی 2

مولانا ظفر علی خاں کے یہاں شاعری کی منزل آخری منزل نہیں ہے۔ بلکہ منزلِ مقصود تک جانے کے لئے ایک ذریعہ منزل مقصود اسلام ہے۔ کیونکہ انھوں نے جگہ جگہ عقائد اسلامی کو منطق استدلال سے پیش کیا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ کسی وجہ سے اسلام کے اوپر کوئی بھی آنچ آئے کیونکہ وہ اسلام کی روشنی میں آپس میں میل جول چاہتے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں نے سیاست کا کوئی بھی ایسا رخ نہیں چھوڑا جس میں ان کا دخل نہ رہا ہو اور انھوں نے ان ہی تاثرات کو اپنے اشعار کے ذریعہ بیان نہ کیا ہو۔ جب تک کانگریس میں رہے۔ کانگریس کی طرف سے لڑتے رہے اور جب اس سے الگ ہوئے تو لیگ میں آ گئے تو ہندو مسلم

1۔ نگارستان۔ مولانا ظفر علی خاں ص 104
2۔ چمنستان۔ " " " ص 76

اتحاد کے لئے کوشش کرتے رہے۔ وطن کی آزادی کو اتحاد کے ساتھ وابستہ دیکھتے ہوئے وہ اسلامی روایات کے تحفظ کو بھی اس کے ساتھ ضروری سمجھتے تھے۔

خلافت تحریک نے ہندوستان کی آزادی کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ اس وجہ سے مولانا ظفر علی خاں نے اس اتحاد کے لئے گاندھی جی کی تعریف کی اور لالہ لاجپت رائے کی موت پر آنسو بہا دیئے تھے۔ انھوں نے کہیں جسٹس کی اہمیت کو واضح کیا اور کہیں گوکل کی بانسری کی گونج سنائی اور کہیں رام چندر جی کے ذریعہ سے ہندوؤں کی تہذیب کی داستان سنائی۔ اس طرح سے ایک دوسرے کی ہمدردی اور دل سوزی سے پیدا کرنے کو وہ کہتے ہیں ؎

خوشی ہے ہندوؤں کو اس لئے یہ فرض ہے انکا
کہ دنیا کو دکھائیں شان اک دل سوز ہمدم کی
مسلماں بھی نہ آن کے عیش و عشرت میں مزاحم ہوں
یہی اک کارگر تدبیر ہے اخلاص باہم کی [1]

مولانا ظفر علی خاں ہندو مسلم اتحاد کے لئے انگریزی حکومت کے مقابلے میں اس حد تک تیار ہو گئے تھے کہ قائداعظم کی قیادت میں انھوں نے مخلوط انتخاب کے حق کو تسلیم کر لیا۔ اس تحریک نے ہندوستان میں بیداری کی لہر پیدا کر دی تھی۔ وہ کہتے ہیں ؎

۱۔ بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 427

ظلم اور تشدد ہو رہے تھے۔ اس کے خلاف انقلاب پیدا کیا۔ اور اس کے لیے آزادی حاصل کی۔ ان کی شاعری کا انقلابی دور 1925ء سے لے کر 1935ء کا ہے۔ کیونکہ مولانا ظفر علی خاں کا انقلاب عمل کا انقلاب تھا۔ اس وجہ سے وہ نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

اے کہ تیرا منتظر ہے جنگ کا میدان اُٹھو
باندھ کر تیغ و کفن اے نوجوان اُٹھو

گو محمدؐ کا جو تھا آباد، ویران ہو چلا
بے خبر سوتا رہے گا کب تک او دربان اُٹھو [1]

مولانا ظفر علی خاں نے اپنی انقلابی نظموں سے ہندوستان اور سرحد میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ وہ نظمیں مندرجہ ذیل ہیں۔ صدر وقت، عزت قومی، عزم آزادی، نالۂ اسیر فطرت، مجاہدین سرحد، انقلاب قید وغیرہ۔ مولانا انقلاب پرور لوگوں کی تعریف کرتے ہیں اور وطن پر شہید ہونے والوں کی یاد میں جنہوں نے موت کا ہنس کر استقبال کیا۔ اور آزادی کی شمعیں روشن رکھیں اور اپنی کشتی حیات کو ڈبو کر دوسروں کی کشتی ساحل تک پہنچائی۔

مولانا کی سیاسی شاعری کے سلسلے میں طنزیہ شاعری انکی شاعری کا اہم ترین حصہ ہے۔ ان کی طنزیہ شاعری قادیان، سنگھٹن اور تشدد کے دینا اور انگریزی سیاست تینوں موضوعات کے گرد

---

1. نگارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص۔ 196

ظلم اور تشدد ہو رہے تھے۔ اس کے خلاف انقلاب پیدا کیا۔ اور اس کے لیے آزادی حاصل کی۔ ان کی شاعری کا انقلابی دور 1925ء سے لے کر 1935ء کا ہے۔ کیونکہ مولانا ظفر علی خاں کا انقلاب عمل کا انقلاب تھا۔ اس وجہ سے وہ نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

اے کہ تیرا منتظر ہے جنگ کا میدان اُٹھو
باندھ کر تیغ و کفن اے نوجوان اُٹھو

گو محمدؐ کا جو تھا آباد، ویران ہو چلا
بے خبر سوتا رہے گا کب تک او دربان اُٹھو [1]

مولانا ظفر علی خاں نے اپنی انقلابی نظموں سے ہندوستان اور سرحد میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ وہ نظمیں مندرجہ ذیل ہیں۔ صدر وقت، عزت قومی، عزم آزادی، ناتواں فطرت، مجاہدین سرحد، انقلاب قید وغیرہ۔ مولانا انقلاب پرور لوگوں کی تعریف کرتے ہیں اور وطن پر شہید ہونے والوں کی یاد میں جنہوں نے موت کا ہنس کر استقبال کیا۔ اور آزادی کی شمعیں روشن رکھیں اور اپنی کشتی حیات کو ڈبو کر دوسروں کی کشتی ساحل تک پہنچائی۔

مولانا کی سیاسی شاعری کے سلسلے میں طنزیہ شاعری انکی شاعری کا اہم ترین حصہ ہے۔ ان کی طنزیہ شاعری قادیان، سنگھٹن اور شدھی کے دھندا اور انگریزی سیاست تینوں موضوعات کے گرد

---

1. نگارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص۔ 196

گھومتی ہے۔ ان کی طنز نگاری نے قلم کی ضرب سے حرب کا کام لیا۔ اور ان کے طنز نے ایسے سخت اشعار کہے۔ جن کا جواب صرف سختیوں کے اور کچھ نہ تھا۔ مولانا ظریف شاعری میں اکبر سے بہت متاثر ہوئے۔ شروع کے دور میں ان کا وہی انداز ہے جو کہ اکبر کی شاعری کا تھا۔ ان کے یہاں اکبر کے لحاظ سے ظرافت اور مزاح دونوں ملتے ہیں ؎

جدید وضع کے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں۔
ہمارے طور طریقے بدلتے جاتے ہیں [1]

یہ دور مولانا ظفر علی خاں کا پہلا دور تھا۔ اس میں اکبر کا رنگ غالب ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کا دوسرا دور انگریزی قید سے شروع ہوتا ہے اس دور کی شاعری کی ابتدا "ستادہ صبح" سے ہو چکی تھی۔ اس میں انھوں نے صوفیوں، مصنوعی پیروں، انگریزوں کے خلاف اور تمام بانیوں پر بھرپور طنز کیا ہے۔ نئی تہذیب پر بھی نئے انداز سے چوٹ کی۔ انگریزوں کے خلاف وہ ہلال اور صلیب کی آویزش یعنی صلیبی جنگ کے عنوان کے تحت لکھ دیتے تھے۔ جب مولانا قید ہوئے تو ان کی طنز نگاری زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ وہ اس تہذیب اور سیاست کے خلاف تھے۔ جس کے اثرات مشرقی تہذیب پر ہوتے تھے اور قید و بند کی نئی قید و عائد ہو گئی۔ جیسے یورپ کا بین الاقوامی قانون ؎

1۔ بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 223

یورپ والو تم سمجھتے ہی نہیں ہو انسان ہمیں
اور جو سمجھتے بھی شاید جانتے ہو نادان ہمیں
آپ ہیں گورے ہم ہیں کالے آپکو شاید ہے یہ خیال
چونکہ ہے کالی اس لئے پیاری ہو نہیں سکتی جان ہمیں 1

پھر اس کے بعد وہ کہتے ہیں ؎

مشرق کی بے ذری سے یہ کہدو کہ چپ رہے
معشوقۂ فرنگ کی منطق ہے نقرئی
تہذیب نو جب آئی تو فوف خدا گیا
اور ساتھ ساتھ شرم رسولِ خدا گئی 2

آگے وہ کہتے ہیں کہ ؎

مغرب کے دیزلوں کی نظر میں ہے دان دن
مشرق کے نقد و متاعِ اماں کی لوٹ
لندن سے جو بچا تھا وہ شملہ میں لوٹ گیا
اور اس پہ مستزاد ہوئی قادیاں کی لوٹ 3

اس کے بعد مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

کیا یوں ہی جاگتی رہے گی قسمتِ فرنگ
اور یوں ہی اس کے سایہ میں سویا کریں گے ہم

---

1. نگارستان ۔ مولانا ظفر علی خاں ۔ ص 54
2. چمنستان ۔ " " " ۔ ص 70
3. " " " ۔ ص 34

بٹہ لگائے جائیں گے مذہب کے نام پر

ملت کی آبرو کو ڈبویا کریں گے ہم !

1936ء سے لے کر 1941ء کی نظمیں جو مجموعہ "چمنستان" میں شامل ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مجلسِ احرار، کانگریس مہاسبھا، کانگریس علماء اور انگریزی حکومت کے خلاف طنز کا ملا جلا تھا۔ اس میں مسلم لیگ کا زور ہو گیا تھا۔ اس لئے مسجد شہید گنج کے حادثہ سے لے کر مجلسِ احرار کے خلاف اور کانگریس اور مسلم لیگ کی انتخابی جنگ پر وارد ہا کی سیاست، یورپ کا قزاق، یورپ کے دیو، ڈلزلے، ہندوستان کا مذہب، جواہر لال نہرو کے فلسفہ کے جواب میں نمرودی جناح کا فلسفہ، پرفیہ اور تلوار جیسی نظمیں شامل ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں کی طنز نگاری سے سیاسی افراد بھی نہیں بچ سکے۔ کیونکہ ان لوگوں کی سیاسی غلطیوں سے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا۔ اس لئے انھوں نے ایسے لوگوں کو نہیں بخشا۔ مولانا کی شاعری میں تاریخ ادب اور سیاست تینوں چیزیں ایک جگہ ہو گئیں۔ ان کے طنز میں سوقیانہ پن یا بدمذاقی کا پہلو کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ ان کی شاعری کا ایک سرا طنز نگاری سے جا کر مل جاتا ہے۔ تہذیبی روایت، تہذیبی ورثہ، تہذیب کا ظاہری پہلو اور باطنی پہلو دونوں کی شائستگی کا اعتراف۔ یہ سب چیزیں قومی تہذیب کے وہ باطنی وصف ہیں۔ جن میں تمام مادی، اخلاقی، جمالیاتی قدریں، تمام عقیدے

1۔ پاکستان، مولانا ظفر علی خاں ص۔ 240

اُٹھیں۔ تجربہ اس طرح مداثرے کا رہن سہن سب شامل ہیں۔ اس تہذیبی روایت سے دنیاوی، سیاسی اور مذہبی رشتے ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں کی شاعری قومی اقدار کے تحفظ پر مشتمل ہے۔ کیونکہ مولانا بنیادی طور پر اتحاد کے حامی رہے۔ چاہے وہ شیعہ اور سنّی کا اتحاد ہو یا ہندو اور مسلمانوں کا سیاسیات میں جتنے ان کے تجربات ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی تمام شاعرانہ صلاحیتوں کو اقدار قومی کے تحفظ کے لئے وقف کر دیا۔

مولانا ظفر علی خاں جتنے دن انگریزوں کی قید میں رہے اس وقت کی شاعری کی ایک اہمیت ہے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی خوبیاں اور نیکیوں کو عام کرنا چاہتا ہے۔ تو وہ ان کا امتحان لیتا ہے۔ اور ان کا امتحان یہ ہوتا ہے۔ کہ ان کو کسی بھی پریشانی میں گرفتار کر دیتا ہے۔ مولانا اپنی قید کو اللہ کی مرضی سمجھتے ہیں۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک امتحان ہے لیکن وہ قید میں بھی زمانے کی سختیوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ کوئی بھی تکلیف یا پریشانی ہوتی ہے تو اس کے لیے وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے فریاد کرتے ہیں۔ وہ اپنے لئے نہیں بلکہ تمام عالم اسلام کی پریشانیوں کا مداوا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

صدہا تیرے غلام نصاریٰ کی قید میں

دن زندگی کے کاٹ رہے ہیں بصد عذاب

دنیا کے گوشہ گوشہ میں ہے گرچہ آجکل

اُمت تری رہین ستم ہائے بے حساب

پھر بھی ہے اس کو لاج ترے نام پاک کی

پروانہ وار جس پہ تصدق ہیں شیخ و شباب 1

مولانا جب قید خانے میں مسلمانوں کی پریشانی کے سلسلے میں سنتے ہیں اور اس کا احساس کرتے ہیں۔ تو وہ ان کی پریشانی کو خود مسلمانوں کی بد عملی کہتے ہیں۔ کیونکہ آپس کی نا اتفاقی کو وہ دشمن کی فتح قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں قید خانہ کی جگہ اس لئے اطمینان کی جگہ ہے۔ کیونکہ قید میں آنے کے بعد جو بھی اظہار کر سکتے ہیں۔ وہ بے فکر ہو کر کر سکتے ہیں۔ ان کے اوپر وہاں کوئی بھی پابندی نہیں ہوتی۔ مولانا کی شاعری کونسل کی ممبری اور سوراج کی حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے کونسل کے ممبروں پر تنقید کی کیونکہ ان کے ضمیر مردہ ہو چکے تھے۔ ان کو اس بات پر بھی قدرت نہیں کہ وہ اپنے اہل وطن کے ابتدائی حقوق دلا سکیں اور اپنے قیدیوں کو آزادی دلا سکیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

جنھیں اپنی کونسلوں میں ہے یہ اختیار حاصل

کہ خود اپنے قیدیوں کو نہ دلا سکے رہائی

جنھیں اپنی ہی زمین پر جنھیں اپنے ہی وطن میں

نہیں مل سکے ہیں اب تک وہ حقوق ابتدائی

کوئی مدعا ہے جس کا نہیں ہو سکا ہے پورا

کوئی آرزو ہے جس کی نہیں آج تک بر آئی

---

1. زمزمہ ستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص۔ 10

ہے خدا کی شان یہ بھی کہ وہ سب اکڑ اکڑ کر

چلے جا رہے ہیں کہنا کہ وہی کریں خدائی

بحوالہ عراق کوئی جا کے ان سے پوچھے

کہ دروں دریچہ کر دی کہ برون خانہ آئی [1]

مولانا ظفر علی خاں کا وہ زمانہ تھا جب ہر شخص سوراج کے چکر میں تھا۔ اس کے اثر کا سارے ہندوستان پر غلبہ تھا۔ مسلمان اپنے کو دونوں طرف سے پریشانی محسوس کر رہے تھے۔ ایک انگریزی حکومت کی طرف سے دوسری ہندو مت کی طرف سے کیونکہ دونوں کی کوشش یہ تھی کہ مسلمان اپنے تہذیب و تمدن اور اپنے ماضی پر غور نہ کرے اس وجہ سے ظفر علی خاں نے ایک نئے انداز میں سوراج کی حقیقت بتائی کہ حقیقی سوراج اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب وہ حق کو مٹتا ہوا نہ دیکھیں۔

مولانا کو قید خانہ کی جگہ باہر کے حالات اور مسلمانوں کے جذبہ عمل کی رفتار سے غافل نہیں کرتی اور قید خانہ کے اندر سے وہ اپنے جذبہ عمل کا اظہار کرتے رہے۔ انھوں نے خدا کا شکر بھی ادا کیا اور خلوص دل سے مسلمانوں کی کامیابی کے لئے دعا بھی مانگی۔ اس زمانے میں ہمارے علما بھی بیدار ہو گئے تھے۔ اس لئے مولانا نے ان کے جذبہ کو بے حد سراہا۔ ہندوستان میں قانون وقت جس طرح استعمال کیا جا رہا تھا۔ مولانا نے ایک نظم میں اس کی حقیقت بیان کی ہے کیونکہ ہندوستان میں وہی قانون انگریزوں کے لئے کچھ اور

---

1. زندگی داستان ۔ مولانا ظفر علی خاں ۔ ص 41

ہے اور ہندوستانیوں کے لئے کچھ اور۔ اس وجہ سے انگریزوں کے زمانے میں حق و انصاف بالکل نہیں تھا۔ اس لئے وہ کہتے ہیں ؎

حق کا نہ کر اظہار کہ قانون یہی ہے
فرماتی ہے سرکار کہ قانون یہی ہے

جینے کی تمنا ہو گر اس عہد میں تجھکو
مرنے کو ہو تیار کہ قانون یہی ہے

ہے جرم یہ جسکا کہ خدا ایک ہے اسکا
ہوگا وہ گرفتار کہ قانون یہی ہے

ڈھائیں جو تیرے سامنے اللہ کے گھر کو
بن نقش بہ دیوار کہ قانون یہی ہے

آواز ڈنمصور کو کہتے ہوئے لبیک
دوڑے رسن دار کہ قانون یہی ہے 1

مولانا ظفر علی خاں نے "ایرانِ فرنگ" کے نام سے ایک نظم لکھی جس میں اس زمانے کے سیاسی قیدیوں کی حالت زار کا اس طرح سے نقشہ پیش کیا ہے ؎

پیستے ہیں جیل میں چکی ایرانِ فرنگ
آسیائے گردشِ دوراں ہے زندانِ فرنگ

پاؤں میں بیڑی گلے میں تختی اور ہاتھوں میں داغ
امت مرحوم پر کیا کیا ہیں احسانِ فرنگ

1۔ بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص۔ 368

صبح کو پالک کے ڈنٹھل شام کو ابلی سود

ہم وہ ہے اس شان سے برسوں ہی مہمانِ فرنگ

ہم سیہ غنتوں کو روغن بھی ملا ہو کر سیاہ

کیونکہ ہے روغن کی زردی حصہ خوانِ فرنگ

نرخ گندم نے ہمیں اولادِ آدم کر دیا

ورنہ کھاتے تھے ہمیں ہر بن کے گاوانِ فرنگ

جھٹ چھٹانک آٹے میں مٹھی بھر تو ہو شملہ کی دھول

ورنہ کیا یاد آئے گی اندازہ نانِ فرنگ [1]

قید خانہ میں بھی مولانا ظفر علی خاں بڑے سے بڑے حاکم کے سامنے سچ کہنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ مولانا نے اس نظم میں اس طرح سے بیان کیا ہے۔

ایک دن سرجان میضی سے یہ مسلم نے کہا

اے کہ اس کشور میں ہے مظہر شانِ فرنگ

کچھ خبر اسکی بھی ہے تجھ کو تیرے دور میں

خلق کو ہے شکوہ جورِ خردانِ فرنگ

صوبہ سرحد کے اندر اک قیامت ہے برپا

ہو گئے غرق اٹک سب عہد و پیمانِ فرنگ

لے کے بنو سے پشاور تک جدھر ڈالی نظر

سب تھے فتنہ شمشیر و پیکانِ فرنگ

1۔ بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 482

ان کے اندر ہندو و مسلم ہیں دونوں پائمال

ان کے خون سے لالہ گوں ہے سم پیکران فرنگ

یہ کبھی سوچا تو نے ہوگا اس جفا کا مزکیا

کب تک آخر یہ جوش و خروش طوفان فرنگ 1

مولانا کی قید خانہ کی شاعری کی خصوصیات انکی نعتیں ہیں۔ ان کو نعت گوئی کا شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ انھوں نے انتہائی خلوص اور نیاز مندی سے اپنی تنہائی کا وقت نعت گوئی کے لئے مخصوص کر دیا۔ اس وجہ سے دین سے لگاؤ زیادہ ہوگیا تھا۔ وہ کہتے ہیں ؎

رحمت باری کہ اپنا جوش کر سکتی نہیں

یہ چڑھی ندی قیامت تک اتر سکتی نہیں

سرور کونین خود ہوں ناخدا جس کی وفا

لطمۂ طوفان موج اجزا سے ڈر سکتی نہیں

کفر سے مجھکو ہے لاگ اور دین سے مجھکو لگاؤ

کوئی اور الزام دنیا مجھ پہ دھر سکتی نہیں

میں فرح سے آنکھ کے جا بیٹھوں گا شاخ سدرہ پر

مرے پر تثلیث کی قینچی کتر سکتی نہیں 2

ایک جگہ ڈاکٹر سید عبداللہ مولانا ظفر علی خاں کی قید خانہ کی شاعری کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

---

1. بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص۔ 483
2. " " " " ص۔ 115

"ظفر علی خاں کی قید خانہ کی اردو شاعری میں اس لحاظ سے ایک خاص اضافہ ہے کہ انھوں نے غم و اندوہ کے اس تصور کو بھی بدلنے کی کوشش کی ہے کہ جو اردو شاعری کے روایات میں شامل ہے۔ یہاں تک کہ زمانے اسیری کے ان تنہائی کے لمحات میں طبیعت کا مغلوب غم ہونا ناقابل یقین تھا۔ تاہم اپنی زبان شاعری سے اپنے غم کی داستان بیان کر کے انھوں نے اپنے آپ یا اپنی شاعری کو مرکز کی توجہ بنانے کا سنگ بھی گوارا نہیں کیا۔"[1]

مولانا ظفر علی خاں کی نظموں کی اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں۔ جو کہ انھوں نے غالب اور اقبال کے انداز اور ان کی زمینوں میں اور اکبر کی زمین میں بھی مختلف نظمیں کہیں۔ ان کی ایک نظم اقبال کے انداز میں ہے جو کہ اقبال کی مشہور نظم ہے۔ "برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی" پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔

برتر از اندیشہ و ارد و سن ہے زندگی
کشف اسرار انا و ما و من ہے زندگی

دینگتے کیڑے میں اور تجھ میں رہا کیا فرق اگر
ہم نشیں محض اتحاد جان و تن ہے زندگی

وہ سرور ہے اپنی ہستی کا گر انسا اعتراف
جس سے پیدا بے لیاقت ہو وہ فن ہے زندگی

1. ڈاکٹر سید عبداللہ "نئی پرانی شاعری" ص 175

درد ہو دل میں تو دوا ہے فرق نہ ہو منزل و رنگ

دل کے اندر اور ہے عالم کی رنگین ہے زندگی

وہ نور و کعبہ ہے اس کی حقیقت پوچھ دیکھ

پاؤں کے چھالے میں کانٹے کی چبھن ہے زندگی

ہے اسیری جو ستم کش کے لئے لطف حیات

حضرت اقبال کو لطف سخن ہے زندگی 1

اس طرح مولانا نے غالب کی مشہور غزل پر بھی اپنے تاثرات کا اظہار ایک نظم میں ادا کئے ہیں ۔

قید فرنگ و بند زیست فرق سے بے نیاز ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ضبط فغاں ہے ہم نفس قید فرنگ کا جواب

دعوئ صبر ہو جیے درد سے تلملائے کیوں

بے گنہوں کے خوں کا داغ پیرہن فرنگ پر

پردہ انقلاب میں رنگ قضا نہ لائے کیوں

ہے دگ جاں کی سرمسار پرچم ہند کی اڑان

جو نہ ملا سکے بہ ڈور وہ بہ پتنگ اڑائے کیوں 2

مولانا ظفر علی خاں قید خانہ کی اردو شاعری میں اس لحاظ سے ایک خاص اضافہ ہے کہ انہوں نے غم و اندوہ کے اس تصور کو بھی بدل دینے کی

1۔ بہار ہندوستان ۔ مولانا ظفر علی خاں ص ۔ 137

2۔ " " " " ص ۔ 102

کوشش کی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ۔

"انھوں نے غم واندوہ کے اس تصور کو بھی بدلنے کی کوشش کی ہے۔ جو اردو شاعری کے روایات میں شامل ہے۔ یہاں تک کہ زمانہ اسیری میں بلکہ مرثیوں میں بھی ان کا لہجہ ایک زار و نزار آدمی کا نہیں اگرچہ تنہائی کے ان لمحات میں طبیعت کا مغلوب غم ہونا یقینی تھا۔ تاہم اپنی زبان شاعری سے اپنے غم کی داستان بیان کرکے انھوں نے اپنے آپ یا اپنی شاعری کو مرکز توجہ بنانے کا ننگ کبھی گوارہ نہیں کیا۔ 'لا نوف علیہم غزلون' ان کا مسلک تھا۔ یہی مسلک ان کی شاعری میں شاستہ قومی اور استوادی کی لفظی تصویر بن کر نمودار ہوا"[1]

اس کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

"ظفر علی خاں جب بھی قید ہوئے تشنگان علم وادب کے لئے اپنے فکر و نظر کی بھٹی سے کوئی نہ کوئی صہبا کشید کر لائے"[2]

مولانا ظفر علی خاں کی اردو شاعری پر اس سے بہتر اور کیا اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔ سب سے زیادہ شہرت ان کی نعتیہ شاعری کو ملی۔ نعت گوئی کے لغوی معنی تعریف اور اصطلاحی معنی رسولؐ کی مدح و ثنا ہے۔ کیونکہ اس صنف کا آغاز رسولؐ کی بعثت کے بعد ہوا۔ اس لئے وہ اشعار جن میں رسولؐ

1۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ نئے پرانے شاعر ص۔ 175

2۔ سید سلیمان ندوی۔ بحوالہ چٹان۔ 27 نومبر 1967ء

کی تعریف کی گئی ہو۔ وہ نعت کہلاتی ہے۔ کیونکہ نعت گوئی کے ذریعہ سے خبر مجسم کا پیغام آئندہ نسلوں تک پہنچا۔ اس کی وجہ سے لوگوں کو ایک مرکز وحدت پر جمع کر دیا۔ اس لئے نعت گوئی کے ذریعہ محبت اور اخوت کے درس دیئے گئے۔ ایسا کوئی بھی شاعر نہیں جس نے رسولؐ کی تعریف نہ کی ہو۔ رسولؐ سے ایمانی رشتہ درحقیقت محبت کا رشتہ ہے۔ جس کے بغیر ایمان کی تکمیل ممکن نہیں۔ نعتیہ شاعری میں اسی ایک جذبہ کی کارفرمائی شاعر کو نغمہ کے لئے ابھارتی ہے۔ جو اس دولت سے سرفراز کرتی ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کی شاعری میں ان کی زندگی کے یہ سارے تاثرات پائے جاتے ہیں۔ جن میں مذہبی تاثرات نہایت نمایاں ہیں۔ ان کا کلام اسلام کے مضامین سے بھرا ہوا ہے۔ کیونکہ ہر وہ چیز جسے اسلام سے برائے نام بھی لگاؤ ہے انھیں بہت عزیز ہے۔ چنانچہ مولانا نے رسولؐ کی جابجا مدح سرائی کر کے اس عقیدت مندی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کا جذبہ مندرجہ ذیل نظموں میں نظر آتا ہے۔ جیسے۔

"فریاد بعضور سرور کونین" (ب۔ ص۔ 30)، "صلو علیہ والہ" (ب ص 32)، "رحمۃ اللعالمین" (ب ص 33)، "شب معراج (ب ص 34)، "نذر عقیدت" (ب ص 43)، "جشن میلاد النبی" (ب ص 44)، "عرش سے فرش تک" (ب ص 47)، "مقام محمدؐ" (ب ص 49)، "عشق رسولؐ" (ب ص 53)، "اللہ والے" (ب ص 58)۔ ان کے علاوہ "شان احمد بجتبیٰ" (ج ص 23)، "[illegible]" (ج ص 178)، "من کان اللہ کان اللہ" (ج ص 218) وغیرہ۔

(ب) سے مراد "بہارستان" از مولانا ظفر علی خاں

(ج) سے مراد "چمنستان" " " "

مولانا ظفر علی خان نے رسولؐ کے حقیقی اوصاف بیان کئے ہیں۔ وہ بھی حقیقت میں احادیث ہی کے مضامین ہیں۔ مثلاً 'عشق رسولؐ' کے تحت حضرت زید رضؓ کے حرم عشق رسولؐ میں منتقل کا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ مولانا کی نعت گوئی کے متعلق شورش کاشمیری اپنا خیال اس طرح سے ظاہر کرتے ہیں۔

"ان کے ممدوحین کی فہرست مختصر لیکن مقدمین کی فہرست طویل ہے۔ جن ہستیوں اور وقیدوں کو انھوں نے خراج ادا کیا۔ ان میں حمد باری تعالیٰ اور نعت رسولؐ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو مستقلاً ہیں۔ اس باب میں انھوں نے سنگلاخ سے سنگلاخ زمین منتخب کیں۔ اور شگفتہ سے شگفتہ مضمون نکالے۔ ان کے نعتیہ کلام کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں۔ کہ وہ دوسرے شعراء کی طرح غلو سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ حضور اکرمؐ کی سیرت کا نقشہ اور ان کے محاسن کی تصویر اس کمال سے پیش کرتے ہیں۔ کہ آنکھوں کے سامنے سیرت النبیؐ چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی نے ایک دفعہ آپ کے قلمی چہرے میں لکھا ہے۔ کہ قیامت کے روز اپنی نعتوں کے باعث بخشے جائیں گے۔ خود ظفر علی خان اپنے اس کلام کو توشۂ آخرت سمجھتے ہیں۔"[1]

مولانا ظفر علی خان نے رسولؐ کی ثنا خوانی میں آپؐ کے جو اوصاف بیان کئے ہیں۔ انھیں زندگی کی حقیقتوں سے ہم آہنگ دکھایا ہے۔ اور مولانا

---

1. نقوش۔ شخصیات نمبر۔ طبعہ 1955ء ادارہ فروغ اردو لاہور

الفتِ رسولؐ کو لطفِ خدا کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ؎

مجھکو رسول اللہ کی الفت لطفِ خدا سے مل ہی گئی۔

اے دل باداں اس سے زیادہ مجھکو ہوس دولت کا حصول 1

ان کے یہاں عقیدت کی فراوانی اور رسولؐ سے بے انتہا محبت کی وجہ سے ذرہ نوازی کے مضامین بہت ملتے ہیں ؎

کہنے کو ہوں آج میں نعت رسولؐ کریم

مری زبان کیوں نہ ہو اشک زبان کلیمؑ

مایۂ نازش مجھے ہے مری فکر رسا

وجہ تفاخر مجھے ہے مری طبع سلیم 2

ایک اور نعت میں مولانا رسولؐ کے سلسلے میں کہتے ہیں ؎

مری تقریر سحر آلود میں کر وہ اثر پیدا

کہ اہل درد کے حلقوں میں اک محشر بپا کر دے

بتا دوں گا کہ خاکِ نیند یوں اکسیر بنتی ہے

مری پلکوں کو جاروب درِ مصطفیٰؐ کر دے 3

اس کے بعد وہ ایک نعت میں کہتے ہیں ؎

مجھے دین و دنیا کی دولت ملی ہے

کہ ہے میرے ہاتھوں میں دامانِ احمدؐ

1۔ بہارستان۔ مولانا فطرت خان۔ ص۔ 18

2۔ " " " " ص۔ 51

3۔ " " " " ص۔ 19

مری مدح کرتی ہے ساری خدائی

ہوا ہوں میں جب سے ثنا خوانِ احمدؐ

ترانے مرے عرش پر گونجتے ہیں

میں ہوں عندلیب گلستانِ احمدؐ 1

اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں تصدق، جاں نثاری اور نیاز مندی کے جذبات کی ترجمانی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں ؎

مرے ہزار دل ہوں تصدق حضورؐ پر

مری ہزار جان ہو قربان مصطفیٰؐ

دشتہ مرا فدا کی فدائی سے ٹوٹ جائے

چھوٹے مگر نہ ہاتھ سے دامانِ مصطفیٰؐ

لائے نہ کیوں یہ نغمہ ملائک کو وجد میں

گاتا ہے جس کو بلبلِ بستانِ مصطفیٰؐ 2

مولانا ظفر علی خاں کی تقلید شاعری کے عنوانات کو دیکھ کر اس کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ ان کو رسولؐ سے کتنی عقیدت تھی۔ ایک نعت میں وہ کہتے ہیں :

جاگ اے شہِ عرب کہ میٹھی نیند سے جاتے کہ آج

لٹ رہا ہے آنکھوں آنکھوں میں تری امت کا راج

ہم ہیں ننگے سر اٹھو اے شانِ عرب ان عجم

اور پہنا دے ہو ہمیں سطوتِ کبریٰ کا تاج

1۔ چمنستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 24

2۔ دد دد دد دد ص 178

اب دوا سے کام کچھ چلتا نہیں بیمار کا

اب تو ہے تیری دعا ہی تیری اُمت کا علاج 1

مولانا ظفر علی خاں نے دوسرے شعراء کے رنگ سے نازک مسائل سے ہمیشہ دامن بچایا ہے۔ ان کے بیان عقیدت کی فراوانی کے باوجود عقیدت مندی میں غلو کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔ انھوں نے مقام رسولؐ کے اظہار میں بہت کچھ کہا ہے۔ کیونکہ ان کی نعت گوئی میں جس چیز کے اظہار میں مقام رسولؐ کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ اور رسولؐ کے مقام کو بیان کرنے میں مضمون نہایت ہی صاف سادہ اور عام فہم نعت میں کہا ہے۔ اور ان کے یہاں ہر مقام پر حقیقی اوصاف کا بیان ملتا ہے۔ اس لئے وہ ایک نعت 'مقام محمدؐ' میں لکھتے ہیں ؎

زمانے میں چمکا ہے نام محمدؐ ہوئی روشن صبح شام محمدؐ

نہ پہنچے وہاں جبرئیل امیں بھی بلند اس قدر ہے مقام محمدؐ

میرا منہ لیا چوم روح الامیں نے لیا میں نے جس وقت نام محمدؐ

پلایا ہے بھر بھر کے ساقی نے مجھکو خدا کے خمستاں سے جام محمدؐ

فقط دو حقائق ہے دنیائے قائم

بقائے خدا و دوام محمدؐ 2

اس طرح رسولؐ کی خوابیدہ کرم سے امت محمدیؐ کا بیڑہ پار ہونا کہیں نعت گو شعراء کے کلام میں ملتا ہے۔ رسولؐ کی اس احسان کے جواب میں شکر گذاری کے مضامین مختلف طور پر شعراء نے باندھے ہیں۔ اس لئے مولانا

1۔ بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص۔ 35

2۔ " " " ص 49

ایک نعت میں رسولؐ کے فیض کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

ایک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں 1

اس کے بعد ایک اور نعت میں کہتے ہیں ؎

عرب کے واسطے رحمت عجم کے واسطے رحمت

وہ آیا لیکن آیا رحمۃ اللعالمین ہو کر 2

مولانا ظفر علی خاں کے نعتیہ کلام میں تغزل کو زیادہ دخل نہیں ہے ان کے یہاں جو بھی اوصاف کا بیان ہے۔ لیکن جگہ جگہ داخلی کیفیت کی آمیزش نے جذبات کی لطافتوں سے نعتیہ کلام کو تغزل کے محاسن سے بھی محروم نہیں رکھا۔ اس کی مثال ان کی ایک نظم سے دی جاتی ہے ؎

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تم ہی تو ہو — ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تم ہی تو ہو

چھوٹا جو سینۂ شب تاراست سے — اس نور اولیں کا اجالا تم ہی تو ہو

ملتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر — اس نقطوں کے شناسا تم ہی تو ہو

جو ماسوا کی حد سے بھی آگے گذر گیا — اے وہ نور دجاؤ اسرے تم ہی تو ہو

آٹھ آٹھ کے لے رہا ہے جو پہلو میں چٹکیاں — وہ درد دل میں کر گئے پیدا تم ہی تو ہو

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے

اے تاجدار یثرب و بطحا تم ہی تو ہو 3

1۔ بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 32

2۔ 〃 〃 〃 〃 ص 33

3۔ 〃 〃 〃 〃 ص 46

مولانا ظفر علی خاں کے نعتیہ کلام کی ایک خصوصیت اثر آفرینی ہے اور یہ اثر آفرینی کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ رسولؐ سے والہانہ محبت میں وارفتگی کا کرشمہ ہے۔ جو سارے نعتیہ کلام میں ملتا ہے۔ مولانا نے ایسے شعر کہے جو کہ اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جب شعر کہتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ خود ہی ان کی اثر میں ڈوب جاتے۔ ان کی اس خصوصیت کی پرکیف مثالیں تمام کلام میں نظر آتی ہیں ؎

وہ اعثا خاک بطحا سے سعادت کا امیں ہو کر — علم بردار حق بن کر سپہ سالار دیں ہو کر
خدا نے اس کو اپنے حسن کے سانچے میں ڈھالا ہے — جھکتا ہے اس کا ہر لو نور جیسے اولیں ہو کر
خدا پر تھا یقیں پہلے پر لیکن اس کا ایماں ہے — کہ آنکھوں میں یقیں پھرنے لگا عین الیقیں ہو کر[1]

مولانا ظفر علی خاں کی نعتیہ شاعری کے سلسلے میں پروفیسر وضیع الدین اپنے خیالات اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔

"مولانا ظفر علی خاں نے حضورؐ کی ثنا خوانی میں آپ کے جو اوصاف بیان کرتے ہیں۔ انھیں زندگی کی حقیقتوں سے ہم آہنگ دکھایا ہے قرآن اور حدیث سے ان مضامین کو خاص طور پر واضح کیا ہے۔ جن سے عظمتِ رسول کے اظہار کے ساتھ ساتھ تعمیرِ حیات کا سامان بھی پایا جاتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی نعت گوئی کا اصلاحی اور مقصدی رنگ فقط حبِ رسولؐ کی سرمستی کا اظہار نہیں ہے۔ یوں کلام میں جذبہ کیف اور شوق کی شدت کا یہ عالم ہے کہ

1۔ بہارستان، مولانا ظفر علی خاں۔ ص 33

گلِ محمدؐ کا فدائی اس گلستان کے کانٹوں سے بھی پیمانِ محبت
باندھ کر انتہائی جذبۂ سرفروشی سے سرشار معلوم ہوتا ہے۔
لیکن مقصدی نظر رکھنے کی بنا پر اس کا یہ جذبہ بے مقصد نہیں ہے
وہ جمالِ محمدیؐ کا فریفتہ بن کر اسوۂ محمدی کی تجلیوں کے لئے بے
تاب رہتا ہے۔ وہ صفاتِ محمدیؐ میں زندگی کی تعمیر کے سامان کا
متلاشی رہتا ہے۔ اس کے نزدیک محمدؐ کے نام پر عقیدہ کشائی کے لئے
اسمِ اعظم کا حکم رکھتا ہے"۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رسولؐ کے لئے ہر وہ کام کر جاتے تھے جو کہ
مسلمانوں کے فائدے کے لئے ہو۔ ان کی ایک نعت جو کہ اردو ادب کے لئے
گوہرِ گراں کا سامان ہے۔[2]

وہ شمعِ اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

جو فلسفیوں سے حل نہ ہوا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئے دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈنے سے ملے گی غافل کو یہ قرآں کے سپاروں میں

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکر و عمر عثمان و علی
ہر مرتبہ ہیں یاران نبی کچھ فرق نہیں ان چاروں میں[2]

1۔ پروفیسر رفیع الدین: اردو میں نعتیہ شاعری، مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ۔ ص 458 کراچی
2۔ بہارِ دکستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 32

مولانا ظفر علی خاں کی نعت گوئی میں یاس و قنوطیت کی پرچھائیں نہیں ملتی۔ نہ ہی کسی افسردہ و مایوس دل کی آہیں۔ بلکہ انھوں نے نعت گوئی میں وجائیت کے عنصر کو سمو دیا اور ملت کے مردہ جسم میں جان پیدا کرنے کا پیغام دیا۔ رسولؐ کے اس اعجاز کو غارِ حرا سے نکل کر ایک قوم ایک ملت اور ایک امت کی تشکیل کی جس نے مشرق و مغرب کے دھارے بدل دیئے۔ جس نے جریدۂ عالم پر تابانی جاوداں کا عنوان رقم کر دیا۔ اس لئے وہ کہتے ہیں ؎

وہ نورِ حقیقت رسولِ خدا نے
منوّر کیا جس نے غارِ حرا کو 1

مولانا ظفر علی خاں کے کلام میں تخیل اور جذبات کا زور ہے۔ اس وجہ سے بیان کی وسعت میں کوئی کمی نہیں ہے۔ ان کے خیالات جھوٹے یا فرضی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اصل **تاثرات** ہیں۔ اور ان کی شاعری میں نئے نئے رنگ بھر دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں رمزیت کم ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں۔ بے خوف ہو کر کہتے ہیں ؎

وادیٔ عشق میں کانٹوں نے نکالا لاکھ سر
پیشوائی کے لئے پاؤں کے چھالے نکلے 2

اس کے بعد کہتے ہیں ؎

1۔ بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 54
2۔ " " " " ص 660

"مالوی" بھی علتی اور "مولوی" بھی علتی

حرفِ علت گر نکل جائے تو ملت ہو ایک 1

پھر وہ ایک نظم میں کہتے ہیں ؎

ایشیا کا پیرہن یورپ کے ہاتھوں پھٹ گیا

بخیہ کرنے کے لئے کابل سے درزی آ گئے 2

مولانا کی شاعری میں گل و بلبل کی رمزیت نہیں ہے۔ کیونکہ رمزیت سیاسی شاعری اور طنز نگاری میں داخل ہو کر ان کی شاعری کا جزو غالب بن جاتی ہے۔ اس فن میں ان کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ مولانا کے یہاں صداقت ہی صداقت ہے۔ اور یہی خوبی ان کی شاعری کو رومانیت میں لے جاتی ہے۔ ان کا عشق مجازی نہیں۔ اس لئے ان کی شاعری بھی جھوٹی نہیں۔ وہ سچے محبوب کی سچی محبت کو قید کے گوشوں میں بھی نہیں بھلاتے۔ کیونکہ ان کے یہاں غلامی سے نجات کا راستہ بتاتی ہے۔ ان کے نعتیہ کلام میں رومانیت کی مثالیں ملتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

میری جان پر چھائے جاتی ہے فنا کی آرزو

اور زبان پہ آئے جاتی ہے بقا کی آرزو

ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اسلام کو لیکر چراغ

کافر عالم خدا کو ہے خدا کی آرزو

1۔ بہادرستان مولانا ظفر علی خاں۔ ص۔ 686

2۔ " " " " ص۔ 696

رات اندھیری کا دھواں جنگل میں اور چپ ہے جرس

قافلے کو ہے ترے بانگِ درا کی آرزو 1

اس کے آگے وہ کہتے ہیں ؎

اٹھ اٹھ کے لے رہا ہے جو پہلو میں چٹکیاں

وہ دردِ دل میں کر گئے پیدا تم ہی تو ہو 2

مولانا ظفر علی خاں کے یہاں کئی تاریخی نظمیں ملتی ہیں۔ جن میں انھوں نے تاریخ کو شعر و ادب کے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ اور واقعہ نگاری میں ایک لطف پیدا کیا ہے۔ ان کے اس کلام میں ایک کلاسیکیت پیدا ہو جاتی ہے۔ سمندر پر نظم اس سلسلے کی ایک اہم مثال ہے۔ جہاں وہ شاعر فطرت کی رنگینی پر غور کرتا ہوا پچھلے تاریخی واقعات کی طرف مڑ جاتا ہے۔ جب وہ ماضی کی تاریخ کو رنگا رنگ موجوں کی طرح سطحِ دماغ سے گزرتے دیکھتا ہے۔ تو سمندر کی موجوں کو تاریخ کی لہروں سے ملا کر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں ؎

میں نے دیکھا ہے تجھے خاکِ عرب کو چومتے

اے خدا تیرے اس آئین پر میری جانیں نثار

سجدہ کرتا دن اسے جب تک ہے تجھ میں جزر و مد

اے ترا نورِ نگہ اس خاکِ اطہر کا نہاد

عرش پر گر فرش بھاری ہے تو ہے اس خاک سے

جس میں محوِ خواب ہے کون و مکاں کا تاجدار 3

1۔ بہارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 643

2۔ " " " ص 46

3۔ [illegible] ظفر علی خاں [illegible]

مولانا ظفر علی خاں سمندر کو اس سرچشمہ عدل و اسلام سے ملانا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ سمندر کو آیت الٰہی سمجھ کر اس فرعون کی تاریخ کو دہرانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ؎

کر تباہ ان کو جو ہیں فرعون بے سامان وقت
حجت اغرقنا کی پھر ظاہر ہوں ان پر ایک بار 1

مولانا ظفر علی خاں کی پہلی اور آخری حیثیت شاعر کی ہے۔ ان کی شاعری کا ایک مقصد تھا۔ وہ ادب برائے ادب کے قائل نہیں تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے انداز بیان کے نئے نئے اسلوب اختیار کیئے۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ دیا۔ نظم نگاری میں انھوں نے ایک نیا انداز پیدا کیا اور ایک نیا مقصد بیان کیا۔ جو کہ ہندوستانیوں کی بھلائی کے لئے تھا۔ ان کا ہر ایک شعر کسی نہ کسی ادبی خوبی کا حامل رہا۔ ان کے موضوعات نے اظہار بیان کے لئے نئے نئے راستے نکالے۔ انھوں نے جو بھی کہا اور جو کچھ پیش کیا اس میں معانی صناعی کا کوئی دخل نہیں ہے۔

1۔ نگارستان۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ص 62

بحیثیت ادیب

مولانا ظفر علی خاں نہ صرف بیباک صحافی، بلند پایہ قومی لیڈر اور اچھے شاعر تھے۔ بلکہ کامیاب نثر نگار اور مترجم بھی تھے۔ اُن کی نثر نگاری ذہن، مزاج اور ماحول کی آئینہ دار ہے۔ ان کی نثر میں بلند آہنگ تراکیب اور شکوہ کا جا بجا استعمال ملتا ہے۔ ان کے یہاں محاورات کا استعمال بڑی کثرت سے ہوا ہے۔ بعض اوقات تو یہ محاورے حُسن لطافت کا مظہر ہوتے ہیں۔ مولانا کبھی کبھی ایسے محاورات بھی استعمال کرتے ہیں جو کہ طبیعت پر گراں گزرتے ہیں۔ جیسے۔ اڑنگے پر لانا، پٹخنی دینا، کرارے پر چڑھنا اور دیدے پٹم کرنا وغیرہ۔ مولانا کی نثر میں جذبے کے علاوہ تخیل کی بھی کارفرمائی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک رومانی نثر نگار بھی تھے۔ جیسا کہ ان کے ایک اقتباس سے معلوم ہوتا ہے۔

"انسانیت کو اگر اپنی اوّلین غیر مسخ شدہ حالت میں دیکھنا ہوں تو ان گھنے جنگلوں میں چلے جاؤ۔ جن کے درختوں کی جڑیں ابھی تک تہذیبِ فرنگ کے نئے کی حربوں سے محفوظ ہیں۔ اس تاریکی میں تمہیں اس نور کی ایک ہلکی سی جھلکی نظر آئے گی۔ جو کبھی آدم کے سینے میں چمکا، کبھی طوبیٰ کی وادی میں جھلملایا اور کبھی

نادان کی چوٹی پر جگمگایا تھا"[1]

اس کے بعد وہ آگے لکھتے ہیں۔

"عقل انسانی صحراؤں کو چھانتی، گلزاروں کو روندتی، سمندروں کو کھنگالتی، ہواؤں کو چیرتی ہوئی آسمانوں کو بھی توڑ کر نکل گئی لیکن اس گھاٹی میں سے ہو کر نہ گزر سکی جو آدمیت کا اولین مرحلہ تھا"[2]

مولانا ظفر علی خاں کی اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک رومانی ادیب کا لہجہ ہے۔ اس میں ان کی شاعری کی طرح نثر میں بھی آہنگ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"کوئی ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کے باشندے مصنوعات میں اپنی ضروریاتِ زندگی کے متکفل آپ نہ ہوں۔ وہ ملک جو اپنے لوازم تمدن کے لئے اغیار کے دستِ نگر ہے۔ بے دست و پر و بال کی طرح طفیل خوار ہے۔ اس پر بھی اگر اسے شاہین تیز پرواز کی ہمسری کا دعویٰ ہو تو اس کی حالت پر رونا چاہئے"[3]

مولانا ظفر علی خاں کی نثر نگاری میں شاعرانہ وسائل سے بھی کام لیا گیا ہے۔ ان کی نثر میں صنائع بدائع کا استعمال جگہ جگہ ہوا ہے۔ کیونکہ ان

1۔ بحوالہ "ہمدرد" مولانا ظفر علی خاں نمبر۔ ص 124

2۔ ایضاً۔

3۔ بحوالہ "ہمدرد" مولانا ظفر علی خاں نمبر۔ ص 125

کی نثر میں شاعرانہ مرقع کشی کا ایک دلآویز نمونہ پیش کرتی ہے۔ ایک اقتباس میں وہ لکھتے ہیں۔

"شام کا سہانا وقت تھا۔ ہوا کے جھونکے تازگی اور فرحت میں بسے ہوئے تھے۔ آسمان کا فیروزہ گوں دامن ابر کے ہر داغ، غبار کے ہر دھبے سے پاک و صاف تھا۔ دامن کوہ کے خودرو پھولوں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ درختوں کی شاخوں میں ہوا کی سرسراہٹ اور چشموں کی آبشاروں کے شور نے قدرت کے اس دلربا منظر میں ایک نئی دلآویزی پیدا کر دی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ دلکشی نظارہ ان بھولے بھالے مہ جمال معصوموں کا تھا۔ جن کو موت کشاں کشاں اس وادی میں لے آئی تھی۔ وہ دیر سے میدان میں کھیل کود میں مصروف تھے۔ افسوس بیچارے اس سے غافل تھے کہ قضا ان کے سر پر کھڑی ہے۔"[1]

ایک جگہ مولانا ظفر علی خاں کی قافیوں کی دلآویزی دیکھئے۔

"وہ قوم دنیا بداوت کی وحشیانہ زندگی بسر کرتے دیکھتی تھی، جس میں سائنسوں کی عظمت و شان نہ تھی، دھماچوکڑی کی آن بان تھی، جو ناآشنائے فلسفۂ افلاطون تھی، ناآشنائے حکمت سقراطون تھی، تہذیب متعارفہ سے بیگانہ تھی، وحشت و بداوت کی دیوانہ تھی، وہی قوم، وہی غیر متمدن قوم

جب شاعری کی دنیا میں آتی ہے۔ تو اس کی زبان ابرِ رحمت بن
کر حکمت بن کر حکمت کے موتی برساتی ہے" 1

اس طرح سے مولانا ظفر علی خاں کی نثر نگاری کا اندازہ ہوتا ہے
کہ وہ ہر پہلو پر لکھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کی نثر نگاری میں ان کے تراجم
کی الگ اہمیت ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خود کی تخلیق ہے۔
اور پڑھنے والے کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمے ہیں۔

اردو ادب میں ترجمے کرنے والوں کی اپنی الگ حیثیت ہے۔
کیونکہ اعلیٰ ترین تخلیقی صلاحیتوں کے حامل فنکاروں کی کبھی بھی کمی نہیں
رہی۔ پھر بھی اس کے باوجود اہل قلم نے تراجم کے ذریعہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں
کا اظہار بہت ہی اچھی طرح کیا ہے۔ جب سے اردو کو وسیلہ اظہار بنایا
گیا ہے۔ اس وقت سے ہر تخلیق کے پہلو بہ پہلو تراجم بھی نظر آتے ہیں۔

اردو میں تراجم کی روایت نہ صرف بے حد قدیم اور پختہ ہے۔
کافی اہل قلم اس میں ابھرتے ہیں۔ ان قلم کاروں میں ایک شخصیت
مولانا ظفر علی خاں کی بھی ہے۔ جو کہ قومی رہنما، بے باک صحافی، شعلہ بیان
مقرر، قادر الکلام اور ان سب پر الگ شخصی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ یہی ان
کی کشش ہی نہیں بلکہ ان تمام پہلوؤں میں یکتا اور منفرد اتنے کہ ہر پہلو پر
جتنا چاہوں لکھ سکتے ہیں۔ مولانا نے علمی اور افسانوی دونوں طرح کی
کتابوں کے تراجم اس وقت کئے جب انگریزی ادبیات سے روشناس نہیں تھے۔

---

1. حقائق و معارف۔ ص 73۔ بحوالہ "مرغزار" مولانا ظفر علی خاں نمبر
ص۔ 127

مولانا ظفر علی خاں نے ایک یادگار ترجمہ ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر کی تصنیف (A. History of the Conflict Between Science and Religion) کا اردو ترجمہ "معرکہ مذہب و سائنس" کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ نواب محسن الملک کے کہنے پر 1895ء میں بمبئی میں کیا اور پنجاب سے شائع ہوا۔ اس تراجم پر پنجاب یونیورسٹی نے مولانا کو پانچ سو (500) روپیہ انعام دیا۔ اس کتاب کو مولانا نے نواب محسن الملک کے نام کیا۔ یہ کتاب پانچ سو (500) صفحات پر مشتمل ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس کتاب کا اسی (80) صفحات کا مقدمہ لکھا اور اس کتاب پر مولانا شبلی نے طویل تبصرہ کیا اور اپنا اظہار خیال کیا:۔

"مترجم صاحب مشہور مترجم ہیں۔ ان کی کتاب "خیابانِ فارس" متداول ہو چکی ہے۔ دکن ریویو نے بھی ان کو کچھ کم روشناس نہیں کیا۔ ترجمہ کی خوبی پر کچھ رائے نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میں انگریزی نہیں جانتا۔ اس لئے ترجمے کی صحت اور غلطی کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ البتہ اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ کسی کتاب کا صحیح ترجمہ اس سے زیادہ اور قریب الفہم نہیں ہو سکتا۔ مترجم کا یہ خاص احسان ہے کہ مصنف نے جہاں کوئی بات اسلام کے خلاف دیکھی۔ انھوں نے نوٹ میں اچھی طرح اس کی پردہ دری کی ہے۔ اس وقت وہ مترجم نہیں بلکہ اچھے خاصے تند مزاج مولوی ہیں۔"[1]

1۔ مقالاتِ شبلی۔ جلد چہارم۔ اعظم گڑھ۔ 1964ء

بیسویں صدی میں روس اور جاپان میں جنگ ہوئی اور جاپان کو فتح ہوئی۔ اس سے ایشیائی لوگوں میں خود اعتمادی پیدا ہوگئی۔ اس اس سے متاثر ہوکر مولانا ظفر علی خاں نے ایک ڈرامہ لکھا۔ جس میں اس جنگ کے حالات کو اپنے انداز میں ترتیب سے لکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو ڈرامہ نویسی پر بھی قدرت حاصل تھی۔ پہلے یہ ڈرامہ دکن ریویو میں قسط وار شائع ہوا۔ اس کے بعد کتاب کی صورت میں ترتیب دیا۔ اس کے سلسلے میں سید بادشاہ حسین نے لکھا ہے۔

"مصنف نے جاپانیوں کے جو یہ قوم پرستی اور وفاشعاری کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ اس سے اصل مقصد یہ تھا کہ جاپانیوں کی قوم پرستی کے افسانہ سے ہندوستانی سبق حاصل کریں۔ ملک اور قوم کی خدمت کے لئے کمر کس لیں ضعیف بیوہ کا خودکشی کرنا محض اس خیال سے کہ اپنے لڑکے کو ماں سے زیادہ قوم و ملک کی خدمت کا موقع ملے۔ اور اس نوجوان کا دھیان صرف قوم و ملک کی طرف رہے۔ اس کے پیش نظر سوائے ملکی خدمت کے اور کوئی کام نہ رہے۔ ڈرامہ بہت طویل ہے۔ اور اسٹیج کے لئے نہیں لکھا گیا۔ حسن و عشق کا چٹخارہ برائے نام ہے۔ نظم و نثر ملے جلے ہیں۔ لیکن پرانی نظم کا بھونڈا پن نمایاں ہے۔ کیونکہ مولانا ظفر علی خاں جس طرح ایک بلند پایہ نثر نویس ہیں اسی طرح بہت

اچھے شاعر ہیں"[1]

لارڈ کرزن وائسرائے ہند کی مشہور تصنیف Persia and Persian Question کی پہلی جلد کا ترجمہ، عزیز مرزا کے کہنے پر مولانا ظفر علی خاں نے "خیابان فارس" کے نام سے کیا۔ اس ترجمے پر حکومت آصفیہ نے تین (3000) ہزار روپے مولانا کی درخواست پر دیئے۔ یہ کتاب 1902ء میں مطبع شمسی حیدرآباد نے شائع کیا۔ اس کتاب کا انتساب نظام حیدرآباد بزبانِ میر محبوب علی خاں بہادر کے نام کیا۔ اور لارڈ کرزن کا بھی شکریہ ادا کیا۔ اور مولانا کو اپنی تصنیف کا ترجمہ کرنے کی اجازت دے دی۔

مولانا ظفر علی خاں کے تراجم کا کمال یہ ہے کہ نثر کا نثر میں اور نظم کا نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ کیونکہ "خیابان فارس" کا ترجمہ دیکھ کر مرزا داغ دہلوی نے مولانا کی زبان و خیالات پر اس طرح سے اظہار کیا ہے۔

"مولانا ظفر علی خاں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ یہ کتاب باعتبار لطف زبان بجائے ترجمے کے اصل کتاب معلوم ہوتی ہے۔ سلسلہ بیان اس قدر باربط اور ایسا سلیس ہے کہ ایک انگریزی خواں نوجوان اور وہ بھی متوطن پنجاب ہو۔ اس میں اس کی توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ اس اعلیٰ درجے کی بامحاورہ اردو میں اتنی ضخیم اور مبسوط کتاب کا ترجمہ

بے تکلف کرنے پر قادر ہو سکے گا" [1]

انگریزی کے صاحب طرز ادیب روڈیارڈ کپلنگ کی مشہور تصنیف The Jungle Book کا ترجمہ بامحاورہ اور سلیس اردو زبان میں مولانا ظفر علی خاں نے "جنگل میں منگل" کے نام سے دورانِ قیام حیدرآباد ۱۹۰۱ء میں کیا۔ اس کتاب میں جانوروں کے قصے عجیب اور دلچسپ انداز میں بیان کئے ہیں۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور جنگلی جانور کا رات کے وقت کا گیت اس طرح سے پیش کرتے ہیں ؎

چھا گئی صفحۂ گیتی پہ شب تیرہ و تار
سو گئے زاغ و زغن اور ہوا شہر ہشیار
گلے ڈھوروں کے سبھی بندھ ہوئے باڑوں میں
پو پھٹے تک عمل اپنا ہے کھلی اپنی
زور و قوت کے دکھانے کی گھڑی آپہنچی
ہو گئے ناخن و چنگال سے ہم بھی تیار

مولانا ظفر علی خاں نے "سیر ظلمات" کے نام سے رائیڈر ہیگرڈ کے ناول کا سلیس اردو میں مولوی عزیز مرزا کی تحریک پر اس کا ترجمہ کیا۔ مولوی عزیز مرزا اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"مولوی ظفر علی خاں صاحب نے جو علم و ادب انگریزی میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہیں۔ ترجمہ اسی خوبی سے کیا ہے

۱۔ بحوالہ انشائے داغ۔ مرتبہ احسن مارہروی دہلوی 1941ء

کہ باوجود مصنف کے زورِ بیان کے قائم رکھنے کے اردوئے معلیٰ
کے دوزمرہ محاوروں کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ اور
یہی اصل تعریف ترجمہ کی ہے۔"

مولانا ظفر علی خاں کے تراجم کا جائزہ لینے سے "تخلیقی مترجم" ہونے
کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ان کی اپنی تخلیق
معلوم ہوتی ہے۔ اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا رس بھی اس میں شامل کرتے
جاتے ہیں۔ ان کو زبان و بیان کا جو گہرا شعور حاصل تھا۔ انھوں نے اس
سے بھرپور موقع اور وقت پر فائدہ اٹھایا ہے۔

کتابیات

اب سے آدھی صدی پہلے کے اخبارات ۔ برجموہن (پنڈت) ۔ 1935ء

اشارات تنقید ۔ سید محمد عبداللہ ۔

۔ مکتبہ خیابانِ ادب ۔ لاہور ۔ 1966ء

ادب کا تنقیدی مطالعہ ۔ سلام سندیلوی ۔ ۔

اردو نثر کے نمونے ۔ محمد طاہر فاروقی ۔ ۔

اردو غزل کے پچاس سال ۔ عبدالاحد ۔ ۔

اردو شاعری کا مزاج ۔ ڈاکٹر وزیر آغا ۔

۔ جدید ناثرین (طبع اول) لاہور ۔ 1965ء

اردو ادب میں طنز و مزاح ۔ ڈاکٹر وزیر آغا ۔

۔ جدید ناثرین (طبع دوم) لاہور ۔ 1966ء

اردو ادب جنگ عظیم کے بعد ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ۔

اخبار نویسوں کے حالات زندگی ۔ محمد دین فوق ۔

انجمن ۔ فقیر وحید الدین ۔ کراچی ۔ 1966ء

بہادستان ۔ ظفر علی خاں ۔ لاہور ۔ 1936

پاکستان منزل بہ منزل ۔ شریف الدین پیرزادہ ۔ ۔ 1966

پاکستان ناگزیر تھا ۔ حسن ریاض ۔ کراچی ۔ 1967

تاریخ ادب اردو ۔ رام بابو سکسینہ ۔

۔ رام کمار پریس ۔ لکھنؤ ۔ 1952

تاریخ ادبیات ۔ محی الدین زور ۔ ۔

اب سے آدھی صدی پہلے کے اخبارات ۔ برجموہن (پنڈت) ۔ 1935ء

اشارات تنقید ۔ سید محمد عبداللہ ۔

۔ مکتبہ خیابانِ ادب ۔ لاہور ۔ 1966ء

ادب کا تنقیدی مطالعہ ۔ سلام سندیلوی ۔ ۔

اردو نثر کے نمونے ۔ محمد طاہر فاروقی ۔ ۔

اردو غزل کے پچاس سال ۔ عبدالاحد ۔ ۔

اردو شاعری کا مزاج ۔ ڈاکٹر وزیر آغا ۔

۔ جدید نا ثرین (طبع اول) لاہور ۔ 1965ء

اردو ادب میں طنز و مزاح ۔ ڈاکٹر وزیر آغا ۔

۔ جدید نا ثرین (طبع دوم) لاہور ۔ 1966ء

اردو ادب جنگ عظیم کے بعد ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ۔

اخبار نویسوں کے حالات زندگی ۔ محمد دین فوق ۔

انجمن ۔ فقیر وحید الدین ۔ کراچی ۔ 1966ء

بہارستان ۔ ظفر علی خاں ۔ لاہور ۔ 1936ء

پاکستان منزل بہ منزل ۔ شریف الدین پیرزادہ ۔ ۔ 1966ء

پاکستان ناگزیر تھا ۔ حسن ریاض ۔ کراچی ۔ 1962ء

تاریخ ادب اردو ۔ رام بابو سکسینہ ۔

۔ رام کمار پریس ۔ لکھنؤ ۔ 1952ء

تاریخ ادبیات ۔ محی الدین زور ۔ ۔

تاریخ ادب اردو ۔ ادارہ ادبیات اردو۔ حیدرآباد دکن ۔ 1953

تاریخ احرار ۔ افضل حق چودھری ۔ لاہور ۔ 1964

تاریخ صحافت اردو ۔ امداد صابری ۔

۔ سعید اشاعت بک ڈپو ۔ دہلی ۔ 1953ء

تاریخ و تنقید ۔ حامد حسن قادری ۔ آگرہ ۔ 1939ء

تاریخ نثر اردو ۔ احسن مارہروی ۔

مطبوعہ مسلم یونی ورسٹی 1930

تحریک خلافت ۔ قاضی عبدالغفار ۔

تحریکات آزاد ۔ غلام رسول مہر ۔ لاہور

تحریک شیخ الہند ۔ مولانا محمد میاں ۔

۔ مکتبہ رشیدیہ ۔ لاہور ۔ 1955ء

ترقی پسند ادبی تحریک ۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ۔ علی گڑھ ۔ 1979ء

ترقی پسند ادب ۔ علی سردار جعفری ۔ علی گڑھ ۔ 1957ء

تنقیدی اشارے ۔ آل احمد سرور ۔ نئی دہلی 1959ء

تقاریر قائداعظم ۔ رفیق افضل ۔ طبع لاہور ۔ 1969ء

جدید اردو شاعری ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ۔

۔ کتاب منزل ۔ لاہور ۔ 1946ء

جدید غزل ۔ رشید احمد صدیقی ۔ علی گڑھ ۔ 1957ء

جدید شعرائے اردو ۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی ۔

جنگِ آزادی میں اردو ادب کا حصّہ۔ معین الحق ۔
۔ ترقی اردو ۔ کراچی 1959ء

چند ہم عصر ۔ ڈاکٹر عبدالحق ۔
۔ انجمن ترقی اردو ہند ۔ علی گڑھ 1957ء

چند شکستہ داستانیں ۔ اشرف عطا ۔ طبع لاہور ۔ 1966ء

چند نئے پرانے شاعر ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ۔ لاہور ۔

چمنستان ۔ مولانا ظفر علی خاں ۔ لاہور ۔

چہرے ۔ شورش کاشمیری کراچی ۔

حالی کی نثر نگاری ۔ ڈاکٹر عبدالقیوم ۔
۔ مجلس ترقی ادب ۔ لاہور ۔ 1964ء

حالی بحیثیت شاعر ۔ شجاعت سندیلوی ۔

حالی کا ذہنی ارتقا ۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ۔ لاہور ۔ 1966ء

حالی کا سیاسی شعور ۔ معین احسن جذبی ۔
انجمن ترقی اردو ہند ۔ علی گڑھ ۔ ستمبر 1959ء

حیات جاوید ۔ مولانا الطاف حسین حالی ۔
۔ اکادمی پنجاب ۔ لاہور ۔ 1957ء

حیات شبلی ۔ سید سلیمان ندوی ۔ اعظم گڑھ ۔ 1943ء

حیات سرسید ۔ نورالرحمٰن ۔ انجمن ترقی اردو ۔ علی گڑھ ۔

حسرت موہانی ۔ عبدالشکور ۔ لکھنؤ 1953ء

خود نوشت سوانح عمری ۔ مولوی سراج الدین احمد ۔ لاہور "زمیندار" 1926ء

خطوطِ مشاہیر ۔ عبدالماجد دریابادی ۔

داستان ادب حیدرآباد ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ۔

۔ ادارہ ادبیات ۔ حیدرآباد (دکن) 1951ء

داستان تاریخ اردو ۔ حامد حسن قادری ۔ طبع آگرہ ۔ 1952ء

ذکر اقبال ۔ ۔ مولانا عبدالمجید سالک ۔

۔ بزم اقبال ۔ لاہور ۔ 1955ء

ذکر شبلی ۔ امین زبیری ۔ مکتبہ جدید لاہور ۔ 1954ء

زبان و بیان ۔ انصاری ۔ آزاد کتاب گھر ۔ دہلی 1928ء

سرسید اور ان کے رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ

سرسید اور ہندوستانی مسلمان ۔ نورالحسن نقوی ۔ علی گڑھ ۔ 1979ء

سرسید کا خواب اور اس کی تعبیر ۔ صلاح الدین احمد ۔

سوانح عمری خواجہ حسن نظامی ۔ ملا واحدی ۔ 1952ء

سرگذشت ۔ عبدالمجید سالک ۔ طبع لاہور ۔ 1966ء

شبلی نامہ ۔ شیخ اکرام ۔ طبع بمبئی ۔

شعرالہند ۔ عبدالسلام ندوی ۔ اعظم گڈھ ۔ 1954ء

صحافتی ادب ۔ اختر جوناگڈھی ۔ کراچی 1951ء

صحافت پاک و ہند میں ۔ عبدالسلام خورشید ۔

مرکزی اردو بورڈ ۔ لاہور ۔ اگست 1966ء

طنزیات و مقالات محفوظ علی۔ محی الدین بدایونی۔ 1974

ظفر علی خاں ۔ اشرف عطا ۔

۔ سندھ ساگر اکادمی۔ لاہور۔ 1966

ظفر علی خاں ۔ شورش کاشمیری ۔ لاہور 1957

ظفر علی خاں ۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ۔

ظفر علی خاں بحیثیت شاعر و صحافی۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ لاہور۔ 1967

ظفر علی خاں بحیثیت شاعر۔ نظیر حسنین زیدی ۔ کراچی 1981

غبارِ خاطر ۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۔ لاہور

غدر کے اخبار ۔ خواجہ حسن نظامی ۔

فنِ صحافت ۔ چودھری رحم علی ہاشمی ۔

۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ دہلی 1943

فن شاعری (بوطیقا) ۔ مرتبہ عزیز احمد ۔

۔ انجمن ترقی اردو ہند ۔ دہلی ۔ 1941

فنِ صحافت ۔ عبدالسلام خورشید ۔

۔ مرکزی اردو بورڈ ۔ لاہور ۔ 1966

فرنگیت کا جال ۔ امداد صابری ۔ دہلی ۔ 1949

کاروانِ صحافت ۔ عبدالسلام خورشید ۔

مذہب اور شاعر ۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین۔ کراچی ۔ 1955

مولانا ظفر علی خاں بحیثیت صحافی ۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی۔ لاہور 1985

مولانا ظفر علی خاں اور ان کا عہد ۔ عنایت اللہ نسیم سوہدروی ۔ لاہور ۔ 1982ء

مقالاتِ شبلی ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ۔

۔ اردو مرکز ۔ لاہور ۔ 1961ء

مقدمہ شعر و شاعری (حالی) ۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی ۔ لاہور ۔ 1953ء

مرآۃ الشعر ۔ عبدالرحمٰن ۔

۔ اردو بازار ۔ لاہور ۔ 1953ء

مسلمانوں کے سیاسی افکار ۔ رشید احمد صدیقی ۔ لاہور

مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ ۔ 1948ء

مارشل لاء سے مارشل لاء تک ۔ سید نور احمد ۔

نگارستان ۔ مولانا ظفر علی خاں ۔ لاہور ۔ 1946ء

نورتن ۔ شورش کاشمیری ۔ لاہور ۔ 1967ء

نئے اور پرانے چراغ ۔ آل احمد سرور ۔ لکھنؤ ۔ 1954ء

نئے ادبی رجحانات ۔ ڈاکٹر اعجاز حسین ۔ الہ آباد ۔ 1957ء

اخبار و رسائل

ادبی دنیا ۔ لاہور ۔ مختلف نمبر 1953ء

احسان روزنامہ ۔ لاہور ۔

احسان ظفر علی خاں نمبر ۔ لاہور ۔

اردو نامہ (سہ ماہی) ۔ کراچی ۔

الہلال ۔ کلکتہ ۔ جون 13ء، 27 نومبر 12ء، مئی 13ء، دسمبر اکتوبر 13ء

انقلاب ۔ لاہور ۔ متفرق پرچے

انصاف ۔ لاہور

الحمرا ۔ لاہور ۔ دسمبر 52ء، 8 اکتوبر 13ء ۔ 15 اکتوبر 13ء

اردو (سہ ماہی) اورنگ آباد ۔ جنوری 21ء، جنوری 22ء، جون 23ء اور جون 5ء

آج کل (ماہوار) دہلی ۔ دسمبر 49ء، ستمبر 51ء، اکتوبر 52ء ۔ جون 53ء، فروری 65ء

برگِ گل ۔ کراچی ۔ سرسید نمبر اردو کالج

برہان ۔ دہلی ۔ جولائی 61ء، جنوری 63ء

تحریک ۔ دہلی ۔ اپریل 1960ء

تہذیب الاخلاق ۔ (ماہوار) علی گڑھ ۔ فائل ۔

زمانہ ۔ کانپور ۔ دسمبر 1908ء، اگست 1928ء

زمیندار (فائل) لاہور ۔ 24، 26، 28، 30، اور متفرق پرچے

زمیندار (گولڈن جوبلی نمبر) لاہور ۔ 1953ء

زمیندار ۔ لاہور ۔ قادیان نمبر، تبلیغ نمبر، یادگار نمبر ۔

تربیت (ہفتہ وار) - 1922ء

پٹھان - لاہور - متفرق پرچے

روزنامہ جنگ - لاہور -

پیسہ اخبار (روزنامہ) لاہور - 8 اکتوبر 1906ء

سب رس (ماہوار) حیدرآباد دکن - جنوری 38ء تا اپریل 40ء

ستارہ صبح - لاہور - 16 مارچ 1917ء

سیاست - لاہور

ساقی - دہلی - جنوری 48ء

علی گڈھ میگزین - علی گڈھ - 51ء سے 56ء تک

علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (ہفتہ وار) علی گڈھ - مکمل فائل -

ماہ نو - کراچی - نومبر 1966ء

معارف (ماہوار) اعظم گڈھ - اگست 28ء اور مختلف نمبر

معارف (ماہوار) علی گڈھ و پانی پت - مکمل فائل -

مسلم گزٹ (چار روزہ) لکھنؤ - مکمل فائل

مرغزار - لاہور - مولانا ظفر علی خاں نمبر

مخزن - لاہور - 1901 سے 1905ء تک کی فائل -

نقوش - لاہور - شخصیات نمبر، آپ بیتی نمبر، خطوط نمبر اور طنز و مزاح نمبر -

نوائے ادب (ماہوار) بمبئی - اپریل 1961ء

ندائے وقت ۔ لاہور ۔ متفرق پرچے

نیا دور ۔ لکھنؤ ۔ اپریل 1966ء

نگار پاکستان ۔ کراچی ۔ سالنامہ 1964ء

نگار ۔ لکھنؤ ۔ حسرت نمبر

وکیل ۔ امرتسر ۔

جہانگیر ۔ چند پرچے ۔

ہمدرد ۔ دہلی ۔ 1926 سے 1928ء

ہمایوں ۔ لاہور ۔ 1952ء

ہماری زبان ۔ علی گڑھ 1965ء

دکن ریویو ۔ حیدرآباد ۔ مکمل فائل ۔

MAULANA ZAFAR ALI KHAN
HAYAT VA KARNAME

Thesis submitted for the Degree of

Doctor of Philosophy

IN

URDU

BY

RIASAT ALI KHAN

Under the supervision of

PROF. NOORUL HASAN NAQVI

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

1993